



ہندوستان و پاکستان دونوں جگہ
قیمت فی کاپی ۱۰/-
سالانہ چندہ پاکستان و ہندوستان
آٹھ روپیہ (مع سالنامہ)
چھ روپیہ (بغیر سالنامہ)

”ہومن نمبر“ دوسرا اڈیشن شائع ہو گیا
دو روپیہ علاوہ محصول

تصانیف نیاز فوری

ہندو مسلم نزاع کو ہمیشہ کے لئے ختم کرنے والی
انجیل انسانیت

من ویزوال

مذہبی استفسارات و جوابات

کا
مجموعہ

مولانا نیاز فوری کی ۲۴ سالہ دو تصنیف و صحافت کا ایک
غیر فانی کا زمانہ جس میں اسلام کے صحیح مفہوم کو پیش کر کے تمام
نوع انسانی کو انسانیت کبریٰ و اخوت عامہ کے ایک رشتہ
سے وابستہ ہونے کی دعوت دی گئی ہو اور جس میں مذاہب
کی تخلیق دینی عقائد رسالت کے مفہوم اور صحافت مقدسہ
کی حقیقت پر تاریخی علمی اخلاقی اور نفسیاتی نقطہ نظر سے
نہایت بلند اشار اور بزرگ خطیبانہ انداز میں بحث کی گئی ہو
ضخامت ۶۷۲ صفحات مجلد نو روپیہ لکھ علاوہ محصول

اس مجموعہ میں جن مسائل پر حضرت نیاز نے روشنی ڈالی ہے
ان کی مختصر فہرست یہ ہے: - اصحاب کہف - معجزہ و کرامت
انسان مجبور ہے یا مختار - مذہب و عقل - طوفان نوح - حضرت
کی حقیقت - مسیح علم و تاریخ کی روشنی میں - یونس اور دہان ماہی
حسن یوسف کی داستان - قارون - سامری - علم غیب - دعا
توبہ - یقمان - عالم برزخ - یاجوج ماجوج - ہاروت ماروت -
حوض کوثر - امام مہدی - نور محمدی اور پل صراط - آتش نمرود وغیرہ
ضخامت ۶۲۴ صفحات کاغذ سفید دبیر قیمت علاوہ محصول پانچ روپیہ لکھ

نگارستان جمالستان

حسن کی عیاریاں

ترغیبات حسنی یا

حضرت نیاز کے بہترین ادبی مقالات
اور افسانوں کا مجموعہ نگارستان نے ادبی کا دوسرا مجموعہ جس میں حسن بیا
ملک میں جو درجہ قبول چل کیا اس کا قدرت خیال اور پاکیزگی زبان کے
انداز اس ہو سکتا ہو کہ اسکے متعدد مضامین بہترین شاہکاروں کے علاوہ بہت
غیر زبانوں میں منتقل کئے گئے اس اڈیشن اجتماعی و معاشری مسائل کا حل بھی
میں متعدد افسانے اور ادبی مقالات نظر آئے گا ہر افسانہ اور ہر مقالہ اپنی جگہ
ایسے اضافہ کئے گئے ہیں جو پچھلے معجزہ ادب کی حیثیت رکھتا ہو اس اڈیشن
ایڈیشنوں میں نہ تھے اس لئے میں متعدد افسانے اضافہ کئے گئے ہیں
ضخامت بھی زیادہ ہے۔ جو پہلے ایڈیشنوں میں نہ تھے۔

اور دوسرے افسانے
حضرت نیاز کے افسانوں کا تیسرا مجموعہ
جس میں تاریخ اور انشاء لطیف کا
بہترین استزاج آپ کو نظر آئے گا اور
ان افسانوں کے مطالعہ سے آپ پر
 واضح ہو گا کہ تاریخ کے بھولے اوراق
میں کتنی دلکش حقیقتیں پوشیدہ تھیں
حضرت نیاز کی ان اشارے اور
زیادہ دلکش بنا دیا ہے۔

شہوانیات مجلد
اس کتاب میں فحاشی کی تمام فطری
اور غیر فطری قسموں کے حالات
تاریخی و نفسیاتی حیثیت سے نہایت شرح
دبیط کے ساتھ محققانہ تبصرہ کیا گیا ہو
کہ فحاشی دنیا میں کہاں کس طرح رائج
ہوئی نیز یہ کہ مذاہب عالم نے اسکے رواج
میں کتنی مذمت کی اس کتاب میں آپ کو
حیرت انگیز واقعات نظر آئیں گے مینا ایڈیشن

قیمت چار روپیہ علاوہ محصول قیمت پانچ روپیہ لکھ آنے علاوہ محصول

قیمت دو روپیہ علاوہ محصول قیمت چار روپیہ علاوہ محصول

قیمت چار روپیہ علاوہ محصول

بالکل آخری اطلاع

نومبر کے نگار میں ایک مطبوعہ کارڈ رکھ دیا گیا تھا تاکہ خریداران نگار اس کی خانہ پوری کر کے واپس کر دیں۔ لیکن سب سے اس طرف توجہ نہیں کی۔ اگر آپ کو اپنے پرچہ میں مطبوعہ کارڈ ملے تو اسے معنی یہ ہیں کہ آپ کی اطلاع ہم کو نہیں ملی (پاکستان کے خریداروں کے نام کارڈ علیحدہ روانہ کئے گئے ہیں) اب آپ کو تکلیف فرما کر مین پیسہ کا صرف گوارا کر کے کارڈ کے ذریعہ سے اطلاع دیدینا چاہئے (کارڈ اب بیرنگ نہیں جاسکتا، تلف کر دیا جاتا ہے) اگر آپ نے اب بھی کوئی اطلاع نہیں دی تو ہم سمجھیں گے کہ آپ کو دور دورہ پیسہ کا اضافہ سالانہ چندہ میں منظور ہے اور آپ کے نام سالنامہ آٹھ روپے چھ آنے میں ذریعہ دی پی بھیجا جائے گا۔ اگر آپ کا چندہ دسمبر ۱۹۵۷ء میں ختم ہو رہا ہے۔ ورنہ دور دورہ پیسہ چھ آنے میں۔ اگر آپ نے اپنی نامظوری کی اطلاع دیدی تو سالنامہ تو آپ کے پاس نہ بھیجا جائے گا لیکن اس کے بعد ختم میعاد پر حسب معمول وہی چھ روپے چھ آنے کا دی پی کیا جائے گا۔

اگر آپ سالانہ چندہ یا سالنامہ کی قیمت ذریعہ منی آرڈر روانہ فرمائیں تو ہر مصارف رجسٹری بھی ضرور شامل کر دیجئے۔ ورنہ سالنامہ کے کم ہو جانے کا اندیشہ ہے۔

پاکستان کے خریداروں کے نام دی پی نہیں جاسکتا اس لئے وہ اپنا سالانہ چندہ آٹھ روپے پانچ آنے یا سالنامہ کی قیمت دور دورہ پیسہ پانچ آنے (۵ روپے ۵۰) یا مصارف رجسٹری ہیں) ذریعہ منی آرڈر ذیل کے پتہ پر روانہ فرما کر ہم کو اطلاع دیں :-

ڈاکٹر ضیاء عباس ہاشمی - ۲۲۲ - پیر الہی بخش کالونی - کراچی

”نگار“ کا آئندہ سالنامہ

حسرت نمبر ہوگا

جو صرف آٹھ روپے سالانہ چندہ ادا کرنے والوں کو مل سکے گا

یہ بات بالکل طے شدہ ہے کہ آئندہ سالنامہ ”حسرت نمبر“ ہوگا لیکن فی الحال یہ بتانا مشکل ہے کہ وہ کس نوعیت کا ہوگا ظاہر ہے کہ اس میں حسرت کے حالات زندگی، انکی شاعری پر تبصرہ، ان کے کلام کا انتخاب ہونا ہی ہے، لیکن اس کے علاوہ اور کیا ہوگا، اس کی تفصیل نہ پوچھیے۔

کوشش کی جا رہی ہے کہ عہد حاضر کے تمام اکابر نقد و ادب کے مضامین حاصل کئے جائیں اور ان کے کلام کا ایسا انتخاب پیش کیا جائے جس سے حسرت کی غزل گوئی کی انفرادیت پوری طرح واضح ہو سکے۔

منیجر نگار

قیمت فی کاپی غیر خریداران نگار سے دور دورہ پیسہ (۵ روپے) - ایجنٹوں سے ایک روپے آٹھ آنے (۵ روپے) فی کاپی -

سالنامہ جنوری ۱۹۵۲ء
دوسرے ہفتہ میں شائع ہو جائے گا

نگار

ادریٹر:- نیاز فتحپوری

جلد ۶۰	فہرست مضامین دسمبر ۱۹۵۱ء	شمار ۶
۲	ملاحظات.....	۲۶
۵	انسان و انسان اعلیٰ..... مسعود جاوید (بی۔ اے).....	۳۵
۱۹	آزاد فنکار..... جلیل عابدی.....	۴۱
۲۳	وسط ایشیا کی جدید شاعری کے نمونے... لطیف الدین احمد.....	۴۴
	ادب لکاتب و الشاعر.....	
	فانی بدایونی (تقابلی مطالعہ)..... سید محمد رشید درویش.....	
	باب المرسلہ والمناظرہ.....	
	مطبوعات موصولہ.....	

پہلے اسے پڑھ لیجئے

دائیں طرف کا صلیبی نشان علامت ہے اس بات کی کہ آپ کا چندہ دسمبر ۱۹۵۱ء میں ختم ہو گیا اور اب آئندہ سال کا چندہ وصول کرنے کے لئے جس میں سالنامہ بھی شامل ہوگا، جنوری، فروری کا مشترک پرچہ ذریعہ دی، پی آٹھ روپیہ چھ آنے میں روانہ کیا جائے گا، اور آپ کو مع فیس منی آرڈر چھ روپیہ آٹھ آنے ادا کرنے کے بعد ملے گا۔

اس لئے اگر آپ سالنامہ نہیں چاہتے تو ازراہ کرم بوالپسی ڈاک مطلع فرمائیے اور ہمیں چھ آنے کے نقصان سے بچائیے۔ اب رجسٹری کے مصارف بھی بڑھ گئے ہیں اور ایک آنہ دی پی ٹیکس بھی زیادہ دینا پڑتا ہے۔

اگر آپ نے سالنامہ لینا پسند نہ کیا تو مارچ ۱۹۵۲ء کا پرچہ حسب دستور چھ روپیہ چھ آنے میں دی، پی کیا جائے گا۔

اگر آپ آٹھ روپیہ چندہ ذریعہ منی آرڈر بھیجیں تو پانچ آنے مصارف رجسٹری بھی ضرور اس میں شامل کر دیں۔ تاکہ سالنامہ آپ کو محفوظ پہنچ سکے۔ چندہ ذریعہ منی آرڈر بھیجنے میں آپ کو تین آنے کی بچت ہوگی۔

پاکستان کے خریدار اپنا سالانہ چندہ (اگر ان کا چندہ دسمبر ۱۹۵۱ء میں ختم ہو رہا ہے) آٹھ روپیہ چھ آنے یا اگر چندہ دسمبر ۱۹۵۲ء کے بعد کسی ہینئر میں ختم ہو رہا ہے تو صرف سالنامہ کی قیمت دو روپیہ پانچ آنے ذریعہ منی آرڈر کرنا چاہئے۔ پتہ سے روانہ فرمائیے۔

زیادہ المناک ثابت ہوگی۔ ظاہر ہے کہ امریکہ ہو یا کناڈا، ان میں سے کسی کو ہمارے ساتھ اس لئے ہمدردی نہیں ہو سکتی کہ یہ انسانیت کا تقاضہ ہے بلکہ صرف اس لئے کہ آہستہ آہستہ یہاں اپنا اقتدار قائم کر کے روس کے فلاح وہ اپنا ایک نیامحاذ طیارہ کرنا چاہتے ہیں، چنانچہ مسٹر جلالہ جارج کیول نے جوکن ڈاک کی طرف سے کوئبو پلان کے ایڈمنسٹریٹر ہیں اپنی ایک تقریر میں صاف صاف ظاہر کر دیا ہے کہ ”اگر مغرب کی جمہوری حکومتیں یہ چاہتی ہیں کہ ایشیا کا وہ حصہ جو ابھی ماسکو کے اثر سے محفوظ ہے، آئندہ بھی محفوظ رہے، تو ان کے لئے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ وہ خود اپنے اثرات ایشیا میں قائم کریں۔“

کناڈا نے حال ہی میں اعلان کیا ہے کہ وہ ایک کروڑ الکر کا گیسول ہندوستان کو تحفہ پیش کرنا چاہتا ہے لیکن صرف اس خیال سے کہ ہندوستان سے فروخت کرنے کے بعد اس کی قیمت کو ملک کی ترقی اور منصوبہ بندیوں کی تکمیل میں صرف کرے گا اور اس طرح اسکی رعایا کناڈا اور امریکہ کے ان احسانات کے اعتراف میں روسی اثرات کو قبول نہ کرے گی۔ لیکن جمہوری حکومتوں کا یہ خواب شرمندہ تعبیر ہوتا نظر نہیں آتا۔ اس میں شک نہیں کہ ہندوستان میں اب بھی افتادہ زمین اتنی ہے کہ اگر اس میں کاشت کی جائے تو پیداوار دو چہند ہو سکتی ہے۔ اسی طرح بہت سی چھپی ہوئی دولتیں معدنیات کی صورت میں بھی یہاں پائی جاتی ہیں اور صنعتی ترقی کے لئے بھی یہاں خام پیداوار کی کمی نہیں لیکن باوجود اس کے یہ بات ہندوستان کے بس کی نہیں کہ وہ اپنی ترقی کے کسی منصوبہ کو کامیاب بنا سکے، کیونکہ اس کے لئے روپیہ سے زیادہ عزم و ارادہ، اخلاق کی بلندی، فرض شناسی اور راعی و رعایا کے باہمی تعاون کی ضرورت ہے اور بدقسمتی سے ان میں سے کوئی چیز یہاں نہیں پائی جاتی۔ مسٹر منشی وزیر غذائیات نے یقین دلایا تھا کہ وہ بہت جلد ہندوستان کو غلہ کی پیداوار کی طرف کفیل بالذات بنادیں گے، لیکن اس کا نتیجہ کیا ہوا انھوں نے سب سے پہلے ”غلہ پیدا کرو“ کی اسکیم ملک کے سامنے پیش کی، جب اس میں کامیابی نہ ہوئی تو ”درخت اگاؤ“ کی تحریک شروع کی اور اب وہ صدر ”دل مضبوط رکھو“ کی تلقین فرما رہے ہیں، اور وہ بھی غالباً اس اطمینان پر کہ اشتراکیت و جمہوریت کی کشش کی بدولت غلہ کی رشوت کسی نہ کسی طرف سے مل ہی جائیگی کس قدر شرم و افسوس کی بات ہے کہ چھین ربع صدی تک جنگ کی مصیبت میں مبتلا رہنے کے بعد جب آزاد ہوتا ہے تو صرف دو سال کے اندر اتنا غلہ پیدا کر لیتا ہے کہ اپنی ہم کروڑ کی آبادی کی ضروریات پوری کرنے کے علاوہ دوسرے ممالک میں بھی اس کی برآمد کر سکتا ہے اور ہندوستان جو ایک صدی سے براہ راست کسی جنگ میں مبتلا نہیں ہوا، آزاد ہونے کے چار سال بعد بھی اس قابل نہ ہوا کہ وہ اپنی آبادی کو زندہ رکھنے کے لئے غیر ممالک کے جم و کرم کا محتاج نہ رہے۔ ہندوستان کے پاس دولت کی کمی نہیں، زمین کی کمی نہیں، خام پیداوار کی کمی نہیں، معدنیات کی کمی نہیں، لیکن اس تمام افراد کے مقابلہ میں بے غرض کام کرنے والوں اور فرض شناس انسانوں کی کمی اتنی بڑی تقریباً ہے کہ ہم اپنے ذرائع خوشحالی میں کسی ایک سے بھی فائدہ نہیں اٹھا سکتے۔ پھر ایسا نہیں کہ حکومت اس حقیقت سے بے خبر ہو، لیکن اس کا علاج اس کے پاس کوئی نہیں۔ کیونکہ اس کا تعلق غلہ سے نہیں بلکہ انسان پیدا کرنے سے ہے اور وہ ملک جس کے اکابر بھی اب بھی ہزاروں سال کی مردہ تہذیب کو زندہ کرنا ترقی سمجھتے ہوں، اب کیا کبھی بھی انسان پیدا نہیں کر سکتا۔ ہندوستان نے تقسیم کے بعد جتنی بھی غلطیاں کی ہوں، لیکن اس کی سب سے بڑی غلطی جس کو زمانہ کبھی معاف نہیں کر سکتا، یہ تھی کہ اس نے آزادی و سیاست دونوں کو ایک چیز سمجھا حالانکہ آزادی حاصل کرنے سے پہلے یہ سوچنے کی ضرورت تھی کہ اس آزادی کو قائم رکھنے کی کیا صورتیں ہو سکتی ہیں۔ حکومت نام نہ صرف آئین سازی کا ہے نہ ارکان پارلیمنٹ کا، بلکہ ان افراد و عمال کا جو حکومت کے قانون اور حکومت کی پالیسی کو چیلناتے ہیں اور ایسے افراد دفعتاً پیدا نہیں ہوتے بلکہ سالہا سال کے تجربے کے بعد آہستہ آہستہ اس منزل تک پہنچتے ہیں۔ کسی ملک کا انتظام یا ایڈمنسٹریشن بچوں کا کھیل نہیں، یہ ایک مستقل فن ہے اور اس کے لئے خاص تربیت یافتہ دماغوں اور معیاری اخلاق رکھنے والے انسانوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ لیکن حصول آزادی کے بعد ہماری حکومت نے بدقسمتی سے اس حقیقت کو بالکل نظر انداز کر دیا اور اس نے سمجھ لیا کہ ہر وہ شخص جو جیل جاسکتا ہے وہ ملک کا انتظام بھی کر سکتا ہے۔ برطانوی قوم جیسی کچھ بھی ہو، لیکن اس سے انکار ممکن نہیں کہ انتظام اور ایڈمنسٹریشن اس کا حصہ تھا جس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ مٹھی بھر انگریزوں کی مدد سے اس نے ہندوستان ایسے بڑے ملک کے نظم و نسق کو اس نہج سے چلایا کہ جب تک اس نے چاہا ملک آزاد نہیں ہو سکا اور اب کہ وہ نہیں ہے ہم کو حکومت کی ایک ایک چول ڈھیلی نظر آرہی ہے۔ ہونا یہ چاہئے تھا کہ حصول آزادی کے بعد انگریز افسروں کو یہاں سے نہ جانے دیا جاتا، گورنر سے لیکر کلکٹر تک بالکل نظم و نسق کا وہی ڈھانچہ باقی رکھا جاتا جو پہلے پایا جاتا تھا اور جب ان سے آٹھ دس سال میں ایڈمنسٹریشن سیکھ لیا جاتا تو انکو آہستہ آہستہ یہاں سے جانے دیا جاتا، لیکن حکومت نے نہ صرف یہ کیا کہ انگریز افسروں کو فوراً رخصت کر دیا (حالانکہ اب انگریزی حکومت انھیں کوئی وظیفہ نہ تھا) بلکہ مسلمانوں کو بھی کلیدی مراصب سے ہٹا دیا (حالانکہ انگریز کے بعد سب سے بہتر ایڈمنسٹریٹر وہی تھے) اور اس طرح اس کا انتظام صرف اس کو بھی ختم کر دیا جو حکومت کو خود اسی کے دوستوں سے بچانے کے لئے از بس ضروری تھا۔

انسان و انسان اعلیٰ

(برنارڈ شا کے ڈرامہ کا ایک حصہ)

(سلسلہ ماضی)

مجسمہ — تم یہ سب کچھ سوچے ہوئے بغیر ہی اتنی خوبی کے ساتھ اس منزل پر پہنچ سکتے تھے فرزان — تم بھی دنیا کے دوسرے عقلمند انسانوں کی طرح ہو — تمہیں ضرورت سے زیادہ داغ مل گیا ہے

ابلیس — اور کیا اس تجربہ نے تمہیں پہلے سے زیادہ مسرور نہیں بنادیا فرزان صاحب؟

فرزان — مسرور؟ — نہیں — البتہ زیادہ عقلمند! — یہ وہ سب سے پہلا لمحہ تھا جس نے مجھے خود مجھ سے اور میرے ذریعہ دنیا سے متعارف کرایا۔ اس وقت میں نے دیکھا کہ ناقابل مزاحمت و بے پناہ "قوت حیات" پر شرائط و قیود عاید کرنے کی کوشش کس قدر بے مصرف ہے یعنی ہوشمندی و مصلحت کوشی — محتاط انتخاب — نیکی — عزت — پاکیزگی و عصمت وغیرہ کی تعلیم دینا کس قدر۔۔۔۔

سارہ — فرزان! — پاکیزگی و عصمت کے خلاف لب کشائی میری اہانت ہے

فرزان — میں تمہاری پاکیزگی و عصمت کے خلاف کچھ نہیں کہتا محترمہ — کیونکہ اس نے ایک شوہر اور ایک درجن بچوں کی شکل اختیار کر لی ہے — اگر تم ایک انتہائی گمراہ و بے یار و مددگار عورت ہو تو تو بھی اس سے زیادہ اور کیا کر سکتی تھیں؟

سارہ — میں یہ کر سکتی تھی فرزان کہ میرے ایک درجن شوہر ہوتے اور بچہ کوئی بھی نہ ہوتا — یہ تنہا وہ جو میں کر سکتی تھی! — اور

یاد رکھئے میری صرف ایک یہی حرکت اس دنیا میں جس کی آبادی میں میری وجہ سے اضافہ ہوا زمین و آسمان کا فرق ہے اگر سکتی تھی

مجسمہ — شاہان سارہ! — اب تم فرزان بالکل چاروں شانے چت ہو گئے

فرزان — بالکل نہیں — کیونکہ اگرچہ یہ فرق حقیقی و بنیادی فرق ہے (مجھے تسلیم ہے کہ محترمہ سارہ بالکل سیدھی اصلی مسئلہ پر پہنچ گئی ہیں)

لیکن یہ فرق درحقیقت محبت و پاکیزگی و عصمت یا وفا شعار کی کافرق نہیں ہے، کیونکہ ایک درجن مختلف شوہروں سے پیدا ہونے والے ایک درجن بچے کرۂ ارض کی آبادی میں اس سے کہیں زیادہ ہتہ اضافہ کر سکتے تھے۔ فرض کیجئے کہ میرا دوست اور تمہارا شوہر فراری

تمہاری تیس سال کی عمر سے پیشتر مر جاتا۔ اس وقت تم کبھی ایک بیوہ بن کر رہ سکتیں کیونکہ تم بہت خوبصورت تھیں۔ فرض کیجئے کہ

فراری کا جانشین تمہاری چالیس سال کی عمر سے پیشتر مر جاتا

اس وقت بھی تم حسن و کشش کے لحاظ سے بے پناہ ہو تیں اور یہ حقیقت ہے کہ

جو عورت دوسری مرتبہ شادی کرتی ہے وہ بشرط آزادی تیسری مرتبہ بھی شادی ضرور کرتی ہے۔ ایک اعلیٰ و معزز خاتون سے ایک

درجن بائیں بچوں کا تین مختلف شوہروں سے پیدا ہونا ناممکن نہیں اور نہ اسے عامہ اسے معیوب قرار دیتی ہے۔ یہ بالکل اور بے شبہ

نیچ ہے کہ ایسی معزز خاتون اس غریب لڑکی سے کہیں زیادہ قانون و روایت کی فرماں بردار ہو سکتی ہے۔ جس کو ہم صرف ایک نامزد

ناجائز بچہ پیدا کرنے کے جرم میں اپنی بیرحم ٹھوکروں سے سلج کی غلاطت میں ڈھکیل دیتے ہیں — لیکن کیا تم یہ کہنے کی جرأت کر سکتی

ہو کہ وہ معزز خاتون اس گنہگار لڑکی سے کچھ کم خواہش پرست اور نفس پرور ہے؟

سارہ — وہ معزز خاقون اس کس مجرمہ سے زیادہ نیک و راست باز ہے۔ بس میرے لئے اتنا ہی سمجھنا کافی ہے۔
 فرزبان — اگر یہ بات ہے تو کیا نیکی و راست بازی صرف شادی شدہ انسانوں کی اجارہ داری کے علاوہ اور کچھ بھی ہو سکتی ہے؟ حقایق کو اپنے سامنے رکھو عزیز سارہ! — ”قوت حیات“ اگر شادی کا کوئی احترام کرتی ہے تو صرف اس لئے کہ یہ شادی کا طریقہ خود اس نے ہی زیادہ سے زیادہ پکے حاصل کرنے اور ان کی بہترین نگہداشت کا سامان ہوتا کرنے کے لئے ایجاد کیا ہے۔ عزت و عصمت و پاکیزگی اور تمہارے دیگر تمام اخلاقی اختراعات کی پروا ”قوت حیات“ کو ذرا بھی نہیں۔ تمام انسانی رسوم میں شادی سب سے زیادہ نفس پرور و بد اخلاق رسم ہے اور۔۔۔۔۔

سارہ — فرزبان!

مجسمہ — (احتجاج کے طور پر) واقعی!

فرزبان — (پورے استحکام سے) میں کہتا ہوں کہ سب سے زیادہ نفس پرور و بد اخلاق رسم! — یہی اس کی مقبولیت کا راز ہے۔ اور جب عورت ایک شوہر کی تلاش میں نکلتی ہے تو وہ شکار کرنے والے درندوں میں سب سے زیادہ ضمیر فراموش حیوان ہوتی ہے۔ شادی کو اخلاق و پاکیزگی کے ساتھ ربط دینے سے انسانی ضمیر کی جس قدر تباہی واقع ہوئی ہے وہ انسان کی کسی بھی دوسری غلطی سے نہیں ہو سکی۔ ذرا تحمل سے کام لو سارہ! — متعجب و برہم ہونے کی ضرورت نہیں۔ تم اس حقیقت کو ہم سب سے زیادہ جانتی ہو کہ شادی مرد کو پھنسانے کے لئے ایک جال ہے جس کے نیچے مصنوعی حسن و خوبی اور فریب انگیز بلند نظریات کے دانے بکھیر دئے گئے ہیں۔ جب تمہاری نیک و خدا رسیدہ ماں نے فہمائشوں اور سزاؤں کے ذریعہ تمہیں اس بات پر مجبور کیا کہ تم ساز پر وہ پانچ چھ نغے بجانا سیکھ جاؤ جن سے اُس کو بھی اسی قدر نفرت تھی جس قدر کہ خود تمہیں تو کیا اس کے پیش نظر اس کے علاوہ اور کوئی مقصد تھا کہ تم سے محبت کرنے والوں کو اس یقین کے فریب میں مبتلا کر دیا جائے کہ تمہارے شوہر کو اپنے مکان میں ایک ایسی عورت بستی نصیب ہوگی جو اس کی چہار دیواری کو موسیقی سے لبریز کر دے گی یا کم از کم طعام کے بعد اُسے نعمات کے ذریعہ لوریاں دیکر سلا دے گی؟ — تم نے میرے دوست فرارسی سے شادی کی۔ لیکن جب مذہب نے تمہیں دو سے ایک کر دیا تو کیا اس ساعت کے بعد بھی تم نے کبھی ساز کو اٹھانے کی کوشش کی؟

سارہ — تم بیوقوف ہو فرزبان۔ ایک فوجوان شادی شدہ عورت کو ساز موسیقی کے سامنے بیٹھ رہنے کے علاوہ اور بہت سے ضروری مشاغل ہوتے ہیں۔ اور اس طرح اُسے ساز کو بجانے کی مشق و عادت نہیں رہتی

فرزبان — اگر وہ موسیقی سے محبت کرتی ہے تو ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا۔ ہرگز نہیں۔ باور کرو وہ تو جال کے ان خوبصورت دانوں کو صرف اس لئے اُٹھ کر ایک طرف پھینک دیتی ہے کیونکہ اب پرندہ جال میں پھنس چکا ہے

سارہ — (تلخی سے) اور مرد تو غالباً اپنے پرندے کو جال میں پھنسانے کے بعد کبھی اپنی نقاب اُٹھاتے ہی نہیں! — شوہر تو گویا کبھی لا پرواہ خود غرض اور بیرحم ہوتا ہی نہیں! — کبھی بھی نہیں!

فرزبان — مرد و عورت اس طرح ایک دوسرے کو جوا بجا ملزم و مجرم قرار دیتے ہیں تو ذرا سوچو سارہ کہ اس سے کیا ثابت ہوتا ہے؟ — صرف یہی کہ ہیر و بھی اسی قدر فریب کار و جعلی ہے جس قدر کہ ہیر و دین

سارہ — یہ سب لغو ہے۔ بیشتر شادیاں مکمل طور پر راحت انگیز ثابت ہوتی ہیں

فرزبان — ”کل طور پر“ کا فقرہ بہت بڑا فقرہ ہے سارہ۔ تمہارا مفہوم یہ ہے کہ سمجھدار لوگ ایک دوسرے کی معیت کو زیادہ سے زیادہ گوارا بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اگر مجھے قید خانہ میں بھیجا جائے اور میرے نزدیک والے سنگین مجرم کے ساتھ مجھے زنجیروں میں جکڑ دیا جائے تو اس لا علاج صورت حال کو مجھے مجبوراً قبول کرنا پڑے گا اور اپنے رفیق کی معیت کو زیادہ سے زیادہ ممکن حد تک

گوارا بنانے کی کوشش کرنا ہوگی۔ لوگ کہتے ہیں کہ ایسی رفاقت متعدد موقعوں پر بہت زیادہ محبت انگیز صورت اختیار کر لیتی ہے اور اکثر و بیشتر کم از کم ایک ہلکی سی دوستی کی شان پیدا ہو جاتی ہے۔ لیکن یہ چیز قیدی کی زنجیروں کو قابلِ تمنا اور قید خانے کو ایک مسرت کردہ نہیں بنا سکتی۔ جو لوگ شادی کی برکات اور اس کے پیمانِ رفاقت داری کی بابت قصیدہ خوانی کرتے نظر آتے ہیں وہی لوگ دوسری طرف یہ بھی اعلان کرتے ہیں کہ اگر یہ زنجیر توڑ دی جائے اور قیدیوں کو انتخاب کی آزادی مل جائے تو سماج کے تمام تار و پود کھر جائیں گے۔ لیکن ایک استدلال کو ہر دو جانب سے اپنی ہی موافقت میں موڑا نہیں جاسکتا۔ اگر قیدی مسرور ہے تو زنجیروں میں جکڑا کیوں جائے؟ اگر مسرور نہیں ہے تو یہ ظاہر کیوں کرے کہ مسرور ہے؟

سارہ — واقعہ کچھ ہی کیوں نہ ہو میں ایک مرتبہ پھر اپنی سن رسیدگی سے فائدہ اٹھا کر تمہیں صاف صاف بتا دینا چاہتی ہوں کہ شادی دُنیائے آباد کرتی ہے اور نفس پروری و عیاشی ایسا نہیں کرتی

فرزان — لیکن اگر کوئی زمانہ ایسا آگیا کہ تمہارا یہ نظریہ صحیح نہ رہا تب؟ — کیا تم کو علم نہیں کہ ارادہ خالق ہے تدبیر کا مرد آج جو کچھ حقیقت کرنا چاہتا ہے اس کے لئے وہ کوئی طریقہ آخر کار دریافت کرے گا۔ جہاں تک تم نیکو کار خواتین اور تمہاری دیکر ہستیوں کا تعلق ہے یقیناً تم سب نے اپنی بہترین کوششیں اس بات پر صرف کر دی ہیں کہ مرد کے دماغ کو کلی طور پر اس چیز کی طرف مایل کر دیں کہ شرفیاء و باعزت محبت ہی سب سے بڑی نیکی ہے اور اس شرفیاء و باعزت محبت کا مفہوم صرف یہ سمجھا جائے کہ مرد حسین و شایستہ اور نازک محبت کش عورتوں ہی کے تصرف میں دنیا کا تمام رومان - حسن اور سامان مسرت تلاش کرے۔ تم نے دوسری طرف عورتوں کو یہ تعلیم دی ہے کہ وہ اپنے شباب - صحت - اعضاء کی متناسب شکل و صورت اور لطافت کو باقی تمام امور پر ترجیح دیں — لیکن ذرا یہ بتاؤ کہ حواس و جذبات کی اس خوبصورت جنت میں روتے ہوئے بچوں اور خانہ داری کی الجھنوں کا مقام کونسا ہے؟ — کیا اس تمام تضاد کا بالکل ناگزیر اختتام و نتیجہ یہ نہیں ہے کہ انسانی ارادہ و خواہش انسانی دماغ سے بالآخر یہ استدعا کرے کہ — ”میرے واسطے کوئی ایسا ذریعہ تخلیق کر دے جس کی مدد سے مجھے محبت - حسن و جمال - رومان - اور احساسات و جذبات تو ضرور نصیب ہو جائیں لیکن ان کے تمام فطری ملذذات یعنی سزائیں - اخراجات - پریشانیوں - امتحانات - امراض - موت کی تکلیفیں اور خطرات - ملازمین - نرس اور ڈاکٹروں اور دوسروں کے استادوں وغیرہ کے بھیمیلوں سے نجات مل جائے۔“

ابلیس — انسان کی یہ خواہش یہاں میری سلطنت میں پوری طرح تسکین پاتی ہے فرزان !

فرزان — ہاں۔ مگر موت کی قیمت کے بدلے! — مرد اس چیز کو اس قیمت پر لینا نہیں چاہتا۔ اس کی خواہش تو یہ ہے کہ تمہارے جہنم کی روانوی مسرتوں سے اُس وقت کسبِ کیف کرے جبکہ وہ کرہ ارض پر موجود ہے۔ بہر حال اس کے ذرائع دریافت کر لئے جائیں گے۔ اگر ارادہ صادق ہے تو دماغ جواب نہیں دے گا۔ وہ دن قریب ہے جبکہ ہر مرد شماری پر دنیا کی بڑی بڑی اقوام اپنی تعداد کو کم ہوتا ہوا دیکھیں گی۔ مختصر دیہاتی مکان اپنی قیمت میں ایک عالیشان خانہ دانی عمارت سے بڑھ جائے گا۔ انسانی نسل کی قنایں تھوڑی سی تاخیر و تعویق پیدا کرنے کے لئے بدکارانہ حد تک لاپرواہ مفلس لوگ اور احمقانہ حد تک نیکو کار دو لختہ انسان انسان نسل کو پستی میں ڈھکیچھنے پر آمادہ ہو جائیں گے۔ لیکن وہ تمام لوگ جو جبری و عاقبت اندیش - کفایت شعارانہ قسم کے خود غرض و عالی حوصلہ تخیل پرست و شاعرانہ فطرت - دولت و راحت مادی کے پرستار اور کامیابی و فنون و محبت کے پجاری کہلاتے ہیں سب کے سب ضبط و تخریب تولید کی تدبیروں سے ”قوتِ حیات“ کی مخالفت کریں گے

مجتہد — تمہارے یہ سب الفاظ بہت سلیس و خوبصورت ہیں میرے نوجوان دوست — لیکن اگر تم دنیا میں اتنے عرصہ تک زندہ رہتے جتنی مدت کہ سارہ کو یا مجھے نصیب ہوئی ہے تو تمہیں یہ بات اچھی طرح معلوم ہو جاتی کہ جو لوگ افلاس - اولاد - اور دیگر تمام خانہ دانی پریشانیوں سے آزاد ہو جاتے ہیں اور زندگی سے حظ اندوزی کے لئے اپنے اوقات وقف کر دیتے ہیں وہ اپنے دماغوں کو دراصل کہولت - بد صورتی

ضعف و نامردی اور موت کے خوف کے لئے آزاد چھوڑ دیتے ہیں۔ ایک بے اولاد مزدور اپنی بیوی کی کاٹی اور دلچسپی و تفریح کے متعلق مطالبات سے جس قدر اذیت و عقوبت پاتا ہے اتنی اُسے بیس بچے بھی نہیں دے سکتے تھے۔ اور پھر اُس کی بیوی کی حالت خود اُس سے بھی زیادہ اذیت انگیز ہوتی ہے۔ فطری پنڈار اور تحسین پسندی کا انسانی حصہ مجھے بھی ملا ہے۔ جب میں نوجوان تھا تو عورتیں میری تعریف کرتی تھیں اور اب جبکہ میں ایک مجسمہ ہوں تو فن کار ناقدین میری تعریف کرتے ہیں۔ لیکن مجھے اعتراض ہے کہ اگر مجھے ان مسرتوں کی کچھڑ میں لوٹنے کے علاوہ دنیا میں اور کوئی کام کرنے کو نہ ملتا تو میں خود کو ذبح کر ڈالتا۔ جب میں نے سارہ کی ماں سے شادی کی یا غالباً زیادہ صحیح طور پر یوں کہئے کہ جب میں نے کوشش مزاحمت ترک کر دی اور سارہ کی ماں کو یہ موقعہ دیدیا کہ وہ مجھے شادی کرے تو میں یہ سمجھتا تھا کہ میں اپنے بستر پر کائے بچھا رہا ہوں اور یہ شادی مجھ جیسے نوجوان اور ہنوز غیر مفتوح افسر کے لئے شکست و گرفتاری کی حیثیت رکھتی ہے۔

سارہ — (ناگواری و برہمی سے) آبا !

مجسمہ — میری عزیز بچی مجھے افسوس ہے کہ میں نے تمہیں صدمہ پہنچایا۔ لیکن چونکہ فرزان نے اس بحث و گفتگو سے تکلف و نفاس کے تمام حجاب ہٹا دیے ہیں اس لئے میں نے بھی بالکل ٹھوس حقیقت کو بیان کرنا مناسب سمجھا

سارہ — آف !۔۔ تو غالباً ان کانٹوں میں ایک میں بھی تھتی

مجسمہ — ہرگز نہیں۔۔ تم اکثر میرے لئے ایک گلاب ثابت ہوئیں۔ تم جانتی ہو کہ تمہاری پریشانیوں کا زیادہ حصہ تو تمہاری ماں نے برداشت کیا۔ فرزان — تو کیا میں یہ دریافت کر سکتا ہوں کہ تان صاحب کہ جب یہ بات ہے تو تم فردوس کو چھوڑ کر یہاں ان مسرتوں کی کچھڑ میں لوٹنے کے لئے کیوں آئے ہو جو بقول تمہارے ایک مرتبہ تمہیں خود کشی پر آمادہ کر چکی ہیں ؟

مجسمہ — (متاثر ہو کر) یقیناً۔۔ یہ بالکل صحیح ہے

المیس — (خون زدہ ہو کر) کیا !۔۔ دیکھو تم اپنے وعدے کو فراموش کر رہے ہو !۔۔ (فرزان سے) اور تمہاری یہ تمام فلسفہ طرازی و حقیقت من اپنے مذہب کی تبلیغ کا ایک پردہ تھی !۔۔ (مجسمہ سے) کیا تم اتنی جلد اُس ہیبت ناک کوفت و بے کیفی کو بھول گئے جس سے میں تمہیں یہاں پناہ دے رہا ہوں ؟ (فرزان سے) اور تم نے اب تک جو کچھ انسان کی ضبط و قطع نسل اور فنا کے نسل کے بارے میں جو دلائل پیش کئے ہیں کیا ان سب کا اس سے بہتر کوئی اور نتیجہ نکلتا ہے کہ فن اور محبت کی ان مسرتوں سے پوری طرح کیفیت حاصل کیا جائے جن کی مدد سے بقول تمہارے خود تمہارے حواس کو شائستگی۔ بلندی اور ارتقاء نصیب ہوا ہے ؟

فرزان — میں نے انسانی نسل کی فنا کے متعلق کوئی ثبوت و دلیل پیش نہیں کی۔ زندگی خواہ اندھے کیڑے مکوڑوں کی شکل اختیار کرے یا کوئی اور شکل جس میں وہ خود کو اب تک منظم کر سکی ہے لیکن یقیناً زندگی کسی حالت میں بھی خود اپنی فنا کا ارادہ و خواہش نہیں کر سکتی۔ واقعہ یہ ہے کہ میں اپنی گفتگو کو پوری طرح ختم نہیں کرنے پایا تھا کہ حضور نے میرا قطع کلام کر دیا۔

مجسمہ — مجھے تو ڈر یہ ہے دوست کہ شاید تم کبھی بھی یہ گفتگو ختم نہ کر سکو گے۔ تم خود اپنی گفتگو سننے کے بہت زیادہ شایق ہو

فرزان — صحیح۔ لیکن اب کہ تم اس قدر برداشت کر چکے ہو اگر اختتام تک تحمل کرو تو اچھا ہے۔ اس سے بہت پیشتر کہ نسل کو بند کر دینے کا یہ جذبہ

ایک صاف و واضح امکان مستقبل کی شکل اختیار کرے اس کا رد عمل شروع ہو جائے گا۔ نسل پیدا کرنے کا زبردست مرکزی مقصد کہ تولید نسل کے تجربات کو ارتقاء و ترقی دیتے آتے آخر کار ایک مافوق الانسان ہستی پیدا کی جائے۔ ہاں یہ مقصد جو آج تک محبت۔

زمان — باطل شرم و حیا اور جھوٹی نفاست و شائستگی کے مسموم بادلوں کے پیچھے پوشیدہ ہے اس پردہ کو چاک کر کے سورج کی پوری

روشنی میں نمودار ہو جائے گا اور اس کے بعد اس اہم مقصد کو ذاتی خواہشات کی تسکین۔ نوجوان لڑکوں لڑکیوں کے خواب مسرت کے

ناممکن الحاصل یا معمر لوگوں کی تبارتی شادی و رفاقت کی ضرورت کے ساتھ فنا اٹھائیں کیا جائے گا۔ معاہدہ میں نکاح و عقد کے

مذہبی فقرات میں صاف و صریح الفاظ کو ناشایستہ سمجھ کر مختصر یا محذوف نہیں کیا جائے گا۔ ایک بنجیدہ نفاسست۔ بنجیدہ ارادہ و عزم اور شادی کے حقیقی مقصد کے ذمہ دارانہ اعلان کو احترام کی نظر سے دیکھا جائے گا اور قبول کیا جائے گا اور تمام رومانوی ہمد و پیمان اور "رفاقت نامہ" قسم کے تمام خوبصورت وعدوں کو قطعی ناقابل برداشت مہملات قرار دیکر شادی کی رسوم سے خارج کر دیا جائے گا میری جنس کے افراد کو انصاف کی نظر سے دیکھو سارہ اور یہ تسلیم کر دو کہ مرد نے ہمیشہ یہی اعتراض کیا ہے کہ بنسی تعلق ایک ذاتی یا دوستانہ تعلق بالکل نہیں ہے

سارہ — ذاتی یا دوستانہ تعلق نہیں! — تو پھر اور کونسا تعلق اس سے زیادہ ذاتی۔ اس سے زیادہ پاکیزہ اور اس سے زیادہ مقدس ہو سکتا ہے؟
فرزان — اگر تم چاہو تو سارہ اس تعلق کو تم پاکیزہ و مقدس کہہ سکتی ہو لیکن ذاتی طور پر یا دوستانہ تعلق ہرگز نہیں۔ خدا سے تمہارا تعلق پاکیزہ و مقدس ہے۔ کیا تم اس تعلق کو ذاتی دوستانہ کہنے کی جرأت کر سکتی ہو؟ بنسی تعلق میں جا نہیں بالکل مجبور آدکار ہیں اس کائناتی تخلیقی قوت کے جو تمام ذاتی لمحوں پر حاوی ہو جاتی ہے اور تمام ذاتی تعلقات کا خاتمہ کر دیتی ہے۔ بنسی تعلق میں متحد ہونے والا انسانی جوڑا ہو سکتا ہے کہ ایک دوسرے کے لئے بالکل اجنبی ہو۔ مختلف مادری زبانیں بولتا ہو۔ نسلی و رنگ میں مختلف ہو۔ عمر و مزاج میں مختلف ہو۔ اور ان کے درمیان کوئی رشتہ بھی موجود نہ ہو سوائے اس مقصد توئید کے جس کی خاطر "توت حیات" نے اُن کو صرف ایک تبادلہ نگاہ کے بعد ایک دوسرے کی آغوش میں گرا دیا ہے۔ کیا یہ اسی چیز کو تسلیم کرنے کا ثبوت ہیں کہ ہم والدین کو یہ اجازت دیتے ہیں کہ وہ عورت سے مشورہ حاصل کئے بغیر ہی شادی کر دیں؟ — کیا تم نے خود اکثر انگریز قوم کی اس بدکاری و بدانتظامی پر نفرت کا اظہار نہیں کیا کہ اس قوم کے شریف مرد عورتیں ایک دوسرے سے متعارف ہو کر بالکل دیہاتی لوگوں کی طرح عشق و محبت کا کھیل کھیلتے ہیں؟ — لیکن ایک دیہاتی جوڑا باہم منسوب ہونے سے پیشتر ایک دوسرے کے متعلق کتنی واقفیت رکھتا ہے؟ — میرا خیال ہے کہ تم جس قدر حقیر واقفیت پر ایک مرد سے محبت و شادی کر سکتی ہو اتنی واقفیت پر تم اسے اپنا قانونی وکیل یا طبی مشیر بھی بنا کر اپنہ کر لو گی!

سارہ — ٹھیک ہے فرزان۔ ہم عیاش مرد کے فلسفہ سے پوری طرح واقف ہیں۔ عورت کے لئے اس کی روش کے کیا نتائج ہوں گے اس کو مرد ہمیشہ نظر انداز کر دیتا ہے۔ اور تم بھی

فرزان — نتائج! — ہاں بیشک نتائج کے بد نظر مرد پر عورت کی خوفناک و زبردست گرفت کو جائز قرار دیا جاسکتا ہے۔ لیکن یقیناً تم اس وابستگی و تعلق کو قلبی و جذباتی نہیں کہہ سکتیں۔ ورنہ ایک پولس کے سپاہی کا جو تعلق اس کے قیدی سے ہوتا ہے اُسے بھی جذباتی کہا جائے گا۔

سارہ — اگرچہ تمہاری نظر میں محبت تمام انسانی تعلقات میں سب سے زیادہ معمولی و خفیف تعلق کا نام ہے لیکن حقیقتاً تمہیں اس امر کا اعتراف کرنا پڑا ہے کہ شادی ایک ضروری چیز ہے

فرزان — تم یہ کیسے کہہ سکتی ہو کہ تمام انسانی تعلقات میں یہ سب سے بڑا تعلق ہیں؟ — اتنا اہم و عظیم تعلق کہ اس میں ذاتی جھگڑات کوئی جگہ نہیں پاسکتے۔ اگر تمہارے والد اپنے وطن کے کسی دشمن کو صرف اس لئے ہلاک کر دیتے کہ انہیں ذاتی طور پر اُس سے کوئی نفرت نہیں ہے تو کیا وہ اپنے وطن کی خدمت کر سکتے تھے؟ اگر کوئی عورت کسی مرد سے صرف اس لئے شادی کرنے سے انکار کر دے کہ اُسے ذاتی طور پر اس مرد سے کوئی محبت نہیں تو کیا وہ اپنے وطن کی خدمت کر سکتی ہے؟ — یقیناً نہیں۔ ایک شریف و معزز عورت کا شادی کرنا اور ایک شریف و معزز مرد کا جنگ کے لئے تلوار اٹھانا یہ دونوں کام ایسے ہیں جو ذاتی سفاصد کے تحت نہیں کئے جاتے بلکہ سیاسی و خاندانی اغراض کے تحت ہوتے ہیں

مجسمہ — (متاثر ہو کر) بڑی پر مغز دلیل ہے یہ فرزان۔ مجھے اس نکتہ پر غور کرنا چاہئے۔ درحقیقت تمہارا دماغ جدید خیالات و اہم نظریات سے لبریز ہے۔ تمہارے ذہن میں یہ نکتہ کس طرح آیا؟

فرزان — میں نے اسے تجربہ سے سیکھا ہے۔ جب میں کرہ ارض پر تھا اور عورتوں کے سامنے اپنے وہ خیالات و جذبات پیش کرتا تھا جو عالم کے طور پر

میسوب قرار دئے جانے کے باوجود اس قدر عجیب تھے کہ ان کی وجہ سے میں ایک نہایت دلچسپ افسانوی ہیرو میں تبدیل ہو گیا تھا تو اس وقت اکثر مشیر میرے ساتھ جو بڑا ڈکھاتا تھا وہ یہ ہے۔ عورت کہتی تھی کہ وہ میرے اقدامات کا تحمل کر سکتی ہے بشرطیکہ یہ اقدامات شریفانہ و باعزت ہوں۔ اس ”شریفانہ و باعزت اقدامات“ کی شرط کا مفہوم تحقیق کرنے پر مجھے جو کچھ معلوم ہوا وہ یہ تھا کہ میں اس عورت کی ملکیت میں بشرط موجودگی حصہ دار بنوں اور اگر اُس کے اخراجات کا کوئی ذریعہ نہیں تو اس کا کفیل ہونا برداشت کروں۔ علاوہ انہیں اُس کی مستقل معیت۔ صلاح و مشورہ اور باہمی گفتگو کو اپنی زندگی کے آخری دن تک ایک قابلِ تمنا شے سمجھتا رہوں اور یہ زبردست قسم کھاؤں کہ میں ہمیشہ ان چیزوں سے مسحور رہوں گا۔ اور سب سے زیادہ اہم یہ عہد کروں کہ میں اس عورت کی خاطر دنیا کی باقی تمام عورتوں کو پس پشت ڈال دوں گا۔ ان شرائط پر اگر مجھے اعتراض تھا تو اس لئے نہیں کہ یہ شرطیں حد سے زیادہ سخت اور غیر انسانی و بیرحمانہ تھیں بلکہ اس لئے کہ ان شرائط کا تعلق موجودہ مقصد سے ذرا سا بھی نہ تھا۔ میں نے ہمیشہ ہر ایک عورت کو پوری بیباکی کے ساتھ یہی جواب دیا کہ مجھے تو ان چیزوں کا کبھی خواب و خیال بھی نہیں تھا۔ نیز یہ کہ اگر اس خاتون کا کردار اور عقل و ذہانت میرے برابر یا مجھ سے برتر ہیں تو اس کی گفت و شنید ضرور مجھے لپٹ اور صلاح و مشورہ مجھے گمراہ کر دے گا۔ علاوہ انہیں یہ کہ بالکل ممکن ہے کہ اس کی مستقل معیت میرے لئے ناقابلِ برداشت حد تک ایک بار بن جائے۔ میں کہتا تھا کہ جب میں اپنے جذبات کے تغیر کی بابت ایک ہفتہ پیشتر کوئی یقین نہیں دلا سکتا تو زندگی کے اختتام تک کی ضمانت کیسے کر سکتا ہوں۔ رہا دنیا کی دوسری عورتوں کے متعلق تو اس کے معنی یہ ہیں کہ میں اپنی دنیا کی نصف آبادی سے تمام فطری و بے تکلف تعلقات کو قطع کر دوں۔ یہ چیز اگر میں نے اختیار کی تو اس سے میری ذہنیت تنگ و محدود ہو کر راہِ راست سے دور ہٹ جائے گی یا پھر مجھے خفیہ و پوشیدہ عشق بازی کے عذاب میں گرفتار کر دے گی۔ اتنا کہنے کے بعد میں عورت سے آخراً یہ صاف صاف طور پر کہہ دیتا تھا کہ میری محبت اور اظہارِ آرزو کو ان تمام معاملات سے ذرا سا بھی تعلق نہیں ہے بلکہ وہ تو اُس خالص سادہ جذبہ کا اظہار ہیں جو کہ فطری طور پر ایک مرد کی جنسی سرفرازی کی عورت کی جنسی سرفرازی کی طرف محسوس کرتی ہے۔

سارہ — تمہارا مقصد یہ ہے کہ یہ ایک غیر انسانی جذبہ ہے؟

فرزان — محترمہ! خود فطرت بھی وہی کچھ ہے جسے تم لفظ ”غیر اخلاقی“ سے تعبیر کرتی ہو۔ مجھے یہ کہتے شرم آتی ہے لیکن میں بالکل معذور ہوں فطرت ایک دلائل ہے۔ وقت غارتگر ہے اور موت ایک قاتل۔ میں نے ہمیشہ ان حقایق کی متابعت کی کوشش کی ہے اور ان کے احساس و اعتراف کے تحت رسوم اور ادارے تخلیق کرنے چاہئے۔ لیکن تم نے ہمیشہ ان تینوں شیطانوں کے مطالبات کو تسکین دینے کو ترجیح دی اور ان کی عصمت و پاکیزگی۔ ان کی ہوشمندی اور ان کی محبت انگیز فطرت کا اعلان کیا۔ اور ان جھوٹی خوشامدی باتوں پر اپنی رسوم و روایات کی بنیاد ڈالی۔ پھر اگر اب یہ رسوم و روایات مطمئن کن طور پر کارفرما نظر نہیں آتیں تو اس میں کوئی تعجب کی بات ہے؟

جستہ — عورتیں کیا کہا کرتی تھیں فرزان؟

فرزان — دیکھو بھئی رازداری دونوں طرف سے برابر ہونا چاہئے۔ پہلے تم یہ بتلاؤ کہ تم عورتوں سے کیا کہتے تھے؟

جستہ — میں! — میں تو قسم کھا کر یہ کہتا تھا کہ جب تک جسم میں روح ہے و قادار ہوں گا اور اگر میری محبت کو قبول نہ کیا گیا تو میں مر جاؤں گا نیز یہ کہ میری نظر میں دنیا کی کوئی عورت وہ حیثیت حاصل نہ کر سکے گی جتنی کہ اُسے حاصل ہے۔۔۔۔۔

سارہ — اُسے؟ — کس کو؟

جستہ — اُس عورت کو جو اس وقت میری مخاطب ہوتی تھی خواہ وہ کوئی بھی کیوں نہ ہو۔ میری پاس چند خاص جملے تھے جو میں ہمیشہ ادا کرتا تھا۔ ان میں سے ایک یہ تھا کہ اُس وقت بھی جبکہ میرا سن و سال انٹی برس کا ہو گا میری محبوبہ کے سر کا ایک سفید بال میرے جسم میں اس سے

کہیں زیادہ شدید پکپکی پیدا کرے گا جتنی کہ کسی انتہائی حسین و زہدان عورت کی خوبصورت زلفیں کر سکتی ہیں۔ دوسرا جملہ یہ تھا کہ میں اس خیال کو برداشت نہیں کر سکتا کہ کوئی اور عورت میرے بچوں کی ماں بنے

فرزان — (نفرت سے) یہ بدکاری و منافقت !

مجسمہ — (مضبوطی سے) ہرگز نہیں۔ کیونکہ میں اس وقت ان تمام خیالات پر اپنی روح کے پورے خلوص کے ساتھ یقین رکھتا تھا۔ تمہارے برعکس میں اپنے پہلو میں ایک دل رکھتا تھا۔ اور میرا یہی خلوص تھا جس نے مجھے کامیاب بنایا

فرزان — خلوص ! — ایک صاف و صریح اور طوفانی و پر جوش جھوٹ کو باور کر لینے کی حد تک احمق بن جانا — یہ ہے وہ چیز جسے تم مخصوص کہتے ہو ! — ایک عورت کے لئے اپنی حرص و ہوس سے اس حد تک مغلوب ہو جانا کہ تم اسے فریب دینے کے شوق میں خود ہی فریب کا شکار ہو جاؤ — تم کہتے ہو یہ خلوص ہے !

مجسمہ — لعنت تمہاری اس کج بکشی پر ! — میں تو ایک عاشق تھا — وکیل نہیں — اور عورتیں اسی لئے مجھ سے محبت کرتی تھیں۔ خدا ان کو اس کا اجر دے !

فرزان — یہ خیال بھی تمہارے ذہن میں عورتوں ہی نے پیدا کیا۔ تم کیا کہو گے اگر میں تمہیں یہ بتاؤں کہ اگرچہ میں عورتوں کے معاملات میں ایک انتہائی بے حس وکیل ثابت ہو رہا تھا لیکن خود عورتوں نے ہی مجھے خود کو ایسا خیال کرنے پر مایل کیا ؟۔ مجھے بھی جذباتی مغلوبیت و حماقت کے ایسے لمحات اپنی زندگی میں نصیب ہوئے ہیں جبکہ میں لغو و مہمل الفاظ کے دریا بہاتا تھا اور ان پر یقین کرتا تھا۔ بعض مرتبہ خوبصورت الفاظ کے ذریعہ عورتوں کو مسرور کرنے کی خواہش میرے دل میں اس قدر قوت کے ساتھ جذباتی سیلاب کو ابھارتی تھی کہ میں قطعی بے خوف اور لاپرواہ ہو کر انہیں اپنی زبان سے ادا کر جاتا تھا۔ اس کے برخلاف بعض اوقات میں خود اپنے جذبات و یقین کی حماقت ایک ایسی شیطانی بے حسی کے ساتھ کرتا تھا جو دوسروں کی آنکھوں میں آنسو کھینچ لاتی تھی۔ لیکن میں نے دیکھا کہ جبرم ہو کر عورتوں سے فرار ہونا اتنا ہی دشوار ہے جتنا کہ نہرمان بن کر۔ جب عورت کی جبلت مجھے شکار کے لئے چن لیتی تھی تو اس کے بعد مگر بھر کی غلامی یا پھر فرار کے علاوہ اور کوئی چارہ کار نہ ہوتا تھا

سارہ — تم خود میرے اور میرے باپ کے سامنے یہ باطل دعویٰ کرنے کی جرأت کرتے ہو کہ تم ہر ایک عورت کے لئے بے پناہ کشش رکھتے تھے۔ فرزان — کیا میں باطل دعویٰ یا خود ستائی کر رہا ہوں ؟ — میرا خیال تو یہ ہے کہ میری شکل و صورت انتہائی قابلِ رحم حد تک حسن و دلکشی سے محروم ہے۔ علاوہ ازیں میرے الفاظ یہ ہیں کہ — ”جب عورت کی جبلت مجھے اپنے شکار کے لئے چن لیتی تھی“ — لیکن ہمیشہ

ایسا نہ ہوتا تھا۔ اور اگر کبھی ایسا ہوتا تھا تو خدا کی پناہ — نہ پوچھو کہ مجھے کتنے شدید پاکبازانہ قہر و غضب کا ہرت بنایا جاتا تھا !

اور مجھے ایک بدسرشت اغوا کار قرار دیکر کتنی زبردست مخالفت و عتاب کی بارش مجھ پر ہوتی تھی

سارہ — لیکن میں نے ایسا نہیں کیا۔ میں نے تو صرف اپنے باپ کو آواز دی تھی

فرزان — ہاں۔ لیکن جب وہ آیا تو تیغ بکھت اور اس بات پر آمادہ کہ مجروح عزت و اخلاق کا انتقام لینے کے لئے مجھے قتل کر ڈالے

مجسمہ — قتل ! — یہ تم کیا کہتے ہو ؟ — میں نے تمہیں ہلاک کیا یا تم نے مجھے ؟

فرزان — ہم دونوں میں کون بہتر و مشاق تیغ زن تھا ؟

مجسمہ — میں تھا

فرزان — یقیناً تم تھے۔ لیکن اُن ہزاروں بدکارانہ انسانہائے محبت کے ہیرو ہونے کے باوجود جو تم ابھی بیان کر رہے تھے تمہیں چنانچہ

جرأت ہو گئی کہ ایک مجروح عزت و اخلاق کا انتقام لینے والے انسان کی حیثیت سے خود کو دنیا کے سامنے پیش کر دو اور میرے لئے موت

کا فتویٰ صادر کر دو۔ صرف ایک اتفاقی امر نے میری جان بچا دی ورنہ تم نے مجھے قتل کر دیا ہوتا

جستہ۔ دنیا کی نظر میں مجھے ایسا ہی کرنا چاہئے تھا فرزان۔ کرہ ارض پر یہ معاملات اسی طرح طے ہوتے ہیں۔ میں کوئی سماجی مصلح نہیں تھا۔ میں تو ہمیشہ وہی کرتا تھا جس کی توقع سماج میں ایک شریف انسان سے کی جاتی ہے۔
فرزان۔ یہ چیز مجھ پر تھا رس حملہ کو جائز بنا سکتی ہے لیکن تم نے بعدہ ایک جستہ کی حیثیت سے جو نفرت انگیز منافقت اختیار کی اس کا جواز نہیں بن سکتی۔

جستہ۔ یہ سب کچھ میرے جنت میں جانے کی وجہ سے ہوا

ابلیس۔ یہ بات میں اب تک سمجھنے سے قاصر ہوں فرزان کہ تمہاری اور پکتان صاحب کی ارضی زندگی کے یہ تمام واقعات اُس فطریہ زندگی کی تحقیر و تردید کیسے کرتے ہیں جو کہ میں رکھتا ہوں۔ میں پھر کہتا ہوں کہ یہاں جہنم میں تمہیں وہ سب کچھ نصیب ہے جس کی تمہیں تلاش تھی اور وہ تمام چیزیں یہاں معدوم ہیں جن سے تم احتراز کرتے تھے

فرزان۔ اس کے برعکس میرا خیال یہ ہے کہ یہاں مجھے ہر وہ شے نصیب ہے جو دنیا میں مایوس کن ثابت ہوئی اور اس میں وہ تمام اجزاء موجود ہیں

جن کو میں پیشتر ہی آزمائش و تجربہ کر کے ناکافی و نامکمل پا چکا ہوں۔ میں تمہیں بتائے دیتا ہوں کہ جب تک مجھے کسی ایسے وجود کے تصور کی اہلیت نصیب ہے جو خود مجھے بہتر و اعلیٰ ہو اُس وقت تک مجھے اگر واقعی سکون و راحت مل سکتی ہے تو صرف اس چیز میں کہ میں اس تخیلی وجود کو زندگی عطا کرنے کی کوشش کرتا رہوں یا اس کے واسطے راستہ صاف کرتا رہوں۔ یہی میری زندگی کا قانون ہے۔ یہی میرے اندر زندگی کی وہ مسلسل جدوجہد ہے جو وہ ایک بلند تر نظام۔ ایک وسیع تر عمیق تر اور شدید تر شعور نفسی اور ایک واضح تر ادراک فردی کے حصول کے لئے ہمیشہ سے کرتی آئی ہے۔ یہ اسی مقصد کی بلندی و فوقیت تھی جس نے میرے نزدیک محبت کو محض

ایک لمبی نشاط۔ فنون لطیفہ کو محض تربیت صلاحیت کے ذرائع اور مذہب کو محض ایک عذر تساہل و تعطل میں تبدیل کر دیا کیونکہ مذہب نے

ایک ایسے خدا کا تصور مجھے عطا کیا جو دنیا کو دیکھتا تھا اور سمجھتا تھا کہ دنیا اچھی ہے حالانکہ میری جبلت میری آنکھوں کے ذریعہ اسی

دنیا کو دیکھتی تھی اور محسوس کرتی تھی کہ دنیا میں اصلاح کی گنجائش باقی ہے۔ میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ خود اپنی ذاتی مسرت۔ ذاتی

صحت اور ذاتی دولت کے حصول کی جدوجہد میں مجھے کبھی خوشی نصیب نہیں ہوئی۔ مجھے جس شے نے "عورت" کے حوالہ کر دیا وہ عورت

کی محبت نہ تھی بلکہ وہ خود میری خستگی و پشیمانی تھی۔ عالم طفولیت میں اگر میں کسی پتھر سے ٹکرا کر اپنے سر کو مجروح کر لیتا تھا تو میں قہر میں

عورت کے پاس دوڑتا ہوا جاتا تھا اور اس کے دامن پر سر رکھ کر اپنی تکلیف کو اپنی آہ و بکا پر صرف کر دیتا تھا۔ جب میں پختہ سن و سال

کو پہنچا اور میری روح اُن بیداریوں اور حماقتوں سے ٹکرا کر مجروح ہو گئی جن کے خلاف میں جدوجہد کر رہا تھا تو میں نے بالکل

وہی پھر ایک بار کیا جو کہ بچپن کے زمانہ میں کر چکا تھا۔ پھر اس میں شک نہیں کہ میں نے اس طرح اپنی آرام و راحت۔ تفریحات۔ اوقات

فرست اور جدوجہد کے بعد اس شدید ترین خستگی و افتادگی میں کافی لطف و کیف حاصل کیا لیکن درحقیقت میں مغربی تہذیب کے

اس تمام سامان نشاط و تفریح سے بہتر اس اطلالی شاعر کے جہنم کو سمجھتا ہوں جسے تم بیوقوف قرار دے چکے ہو اور یہی وہ شے ہے

جس نے تمہارے اس موجودہ جہنم کو۔۔۔ اس ابدی نشاط کدہ کو میرے واسطے اس قدر ہلک و تباہ کن بنا دیا ہے۔ یہی وہ جبلت ہے

جس کے فقدان نے تمہیں اس عجیب عفریت کی شکل دیدی جسے ابلیس کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ تم نے لوگوں کو ان کے ان حقیقی مقاصد

سے جو کسی نہ کسی حد تک خود میرے مقصد حیات کے مانند تھے بڑی کامیابی کے ساتھ منحرف کر کے خود اپنے مقاصد کی طرف متوجہ کر دیا

ہے اور تمہاری یہی وہ کامیابی ہے جس نے تمہیں "ترغیب و ہندہ" کا لقب عطا کیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ لوگ اپنے ارادہ و مقصد

کے مطابق عمل کرنے کے بجائے تمہارے ارادہ و مقصد کے لئے کار فرما ہیں یا زیادہ صحیح الفاظ میں یوں کہو کہ تمہارے فقدان مقصد کے

ساتھ بہتے جا رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہ سب لوگ بچپن و بے آرام۔ مضطرب و بد مزہ اور مصیبت زدہ ہیں اور اُن کی زندگی گریز باطل

اور تصنع آمیز ہے

ابلیس — (مجرد احساس کے ساتھ) فرزان صاحب — آپ میرے دوستوں کے ساتھ بد اخلاقی کا مظاہرہ کر رہے ہیں۔
 فرزان — (اظہار نفرت کے ساتھ) میں ان کے یا تمہارے ساتھ اخلاق کا پرتاؤ کیوں کروں؟ دروغ و کذب کے اس محل میں جو دوزخ کہلاتا ہے میری زبان سے نکلنے والی ایک یا دو سچی باتیں تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچائیں گی۔ تمہارے دوستوں سے زیادہ بیوقوف کتنے میں نے آج تک نہیں دیکھے۔ تمہارے دوست حسین و دلکش نہیں بلکہ محض مزین و مرتجع ہیں۔۔۔ وہ پاک و صاف نہیں بلکہ سطحی طور پر صاف بنے ہوئے ہیں۔ وہ شاندار و پُر سطوت نہیں بلکہ محض خوش قطع لباس میں ملبوس ہیں۔ وہ تعلیم یافتہ نہیں بلکہ محض تعلیمی اداروں میں سے گزرنے والے راہرو ہیں۔ وہ مذہبی انسان نہیں بلکہ مذہبی نشستوں کے مالک ہیں۔ وہ پاکیزہ اخلاق کے حامل نہیں بلکہ صرف روایت پرست ہیں۔ وہ نیک سرشت نہیں بلکہ محض بزدل ہیں۔ وہ تو بد سرشت بھی نہیں بلکہ محض "کمزور" ہیں۔ وہ فن کار نہیں بلکہ صرف موس پرست ہیں۔ وہ خوش حال نہیں بلکہ صرف دولت مند ہیں۔ وہ وفادار نہیں بلکہ محض غلامی پسند ہیں۔ فرض شناس نہیں بلکہ محض ایک بھیڑ کی طرح مطیع۔ فلاح عام کے جذبہ کے مالک نہیں بلکہ صرف وطن پرست۔ جبری و باہمت نہیں بلکہ محض افتراق پسند۔ صاحب عزم و استقلال نہیں بلکہ صرف ضدی۔ یارِ عیب پر وقار نہیں بلکہ صرف جابر۔ اپنے جذبات و خواہشات پر قادر نہیں بلکہ کند و بیمار جذبات کے مالک۔ غیرت مند نہیں بلکہ صرف مغرور۔ مہربان و ہمدرد نہیں بلکہ محض جذباتی۔ ملنسار نہیں بلکہ محض جانوروں کی طرح گروہ پسند۔ دوسروں کے جذبات کے پاسدار نہیں بلکہ محض شایستہ۔ ذہین نہیں بلکہ صرف خود رائے۔ ترقی پسند نہیں بلکہ صرف ذاتی ترقی کے تلاشی و خود غرض۔ قوتِ تخیل و تصور کے مالک نہیں بلکہ محض اہام پرست۔ انصاف پسند نہیں بلکہ محض انتقام پسند۔ فیاض نہیں بلکہ صرف چا پلوس۔ نظم و قواعد کے پیر و کار نہیں بلکہ محض خون زدہ۔ اور صداقت تو ان میں ہے ہی نہیں۔ ان میں سے ہر ایک شخص جھوٹا ہے جس کے رنگ و ریشہ میں جھوٹ سرایت کر چکا ہے

مجسمہ — تمہارے الفاظ کی روانی تو بڑی حیرتناک ہے فرزان! — کاش میں بھی اپنے سپاہیوں سے اسی طرح باتیں کر سکتا!
 ابلیس — لیکن یہ صرف باتیں ہی ہیں۔ یہی سب کچھ پہلے بھی کہا جا چکا ہے۔ لیکن کیا کبھی اس نے کوئی انقلاب پیدا کیا؟ کیا دُنیا نے کبھی ان باتوں پر توجہ دی؟

فرزان — بیشک یہ صرف باتیں ہی باتیں ہیں۔ لیکن سوچو کہ آخر یہ صرف باتیں ہی کیوں ہیں؟ — صرف اس لئے میرے دوست کہ حسن و جمال، پاکیزگی، عزت و شرافت، مذہب، اخلاقیات، فن، حب وطن، شجاعت اور اسی نوعیت کی باقی سب چیزیں محض الفاظ ہیں جن کو ہم یا تم ایک داستان کی طرح جب چاہیں سیدھا اٹا کر سکتے ہیں۔ اگر یہ چیزیں حقیقت ہوتیں تو جو الزامات میں نہ تم پر عاید کئے جیر، ان کا تم کو اعتراف کرنا پڑتا۔ لیکن میرے ابلیس دوست یہ تمہارے وقار و عزت کی خوش قسمتی ہے کہ یہ چیزیں حقائق نہیں ہیں۔ بقول تمہارا، یہ سب محض الفاظ ہیں جن کے ذریعہ وحشی لوگوں کو بیوقوف بنا کر تہذیب اختیار کرنے پر مایل کیا جاسکتا ہے اور مہذب مفلسوں کو فریب دیکر غارت گری و غلامی پر صابر و شاکر رکھا جاسکتا ہے۔ حکمران طبقہ کا یہی سرِ بستہ و نسلی راز ہے۔ ہم لوگ جو ایک ایسے ہی طبقے سے متعلق ہیں اگر خود اپنی مصیبت زدہ زندگی کے لئے زیادہ قوت و عشرت کے حصول کی جدوجہد کے بجائے ساری دُنیا کو زیادہ زندگی دینے کی کوشش کرتے تو یہی راز ہم کو ایک بلند مرتبہ عظیم قوم بنا دیتا۔ اب چونکہ میں خود ایک بلند مرتبہ و عالی طبقہ کا فرد ہونے کی وجہ سے اس راز سے واقف ہوں اس لئے ذرا تصور کرو کہ اخلاقی رنگ کاریوں کے متعلق تمہاری یہ منافقانہ و لاتماہی تقریریں میرے لئے کس درجہ مضحکہ منہج ثابت ہو سکتی ہیں اور ان کے لئے تمہاری اپنی زندگی کی قربانیاں کس قدر غلیظ حد تک تباہ کن۔ اگر تم اپنے اخلاقی کھیل پر صرف اتنا یقین و ایمان رکھتے کہ اسے دیانت کے ساتھ کھیل سکتے تو اس حالت میں بھی اس کا تاثر دلچسپ نہ ہوتی۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ تم ایسا بھی نہیں کرتے۔ تم ہر قدم پر دھوکہ دیتے ہو اور جب تمہارا حریف اس فریب کاری میں تم پر سبقت لیجاتا

تو تم کھیل کو درہم برہم کر دیتے ہو اور اسے قتل کرنے کی کوشش کرتے ہو

ابلیس — کہہ ارض پر ممکن ہے کہ ان باتوں میں کچھ صداقت ہو کیونکہ وہاں لوگ غیر تعلیم یافتہ ہیں اور میرے مذہب حسن و محبت کی صحیح قیمت کا اندازہ نہیں کر سکتے — لیکن یہاں — — — — —

فرزان — ہاں ہاں — میں خوب واقف ہوں — یہاں محبت اور حسن کے علاوہ اور کچھ بھی نہیں — اُٹ! — یہ تو بالکل ایسا ہی ہے جیسے کوئی تماشائی ایک رسمی ڈرامہ کے صحن پہلے ایکٹ کو ہی ابدالآباد تک دیکھتا رہے اور ڈرامہ کی پیچیدگیاں کبھی شروع نہ ہوں! — اوہام پرستانہ دہشت و خوف کے بدترین لمحات میں بھی مجھے کبھی یہ تصور نہیں آیا کہ جہنم اس درجہ خوفناک مقام ہو سکتا ہے۔ یہاں میری زندگی ایک مشاطہ کی طرح حسن کے مسلسل فکر و خیال میں اور ریشمی زلفوں سے کھیلے ہوئے گزرتی ہے۔ میں ایک شیرینی فروش کے ملازم کی طرح مسلسل طور پر ایک شیریں فضا میں سانس لیتا ہوں — کپتان صاحب! کیا جنت میں کچھ حسین عورتیں ہیں؟

مجسمہ — کوئی نہیں — قطعی نہیں — سب کی سب بدہیبت و بد قطع ہیں۔ درجنوں عورتوں کو دیکھ جائیے تو ان کے پاس چند پیسوں کے زیورات نہیں گے۔ انہیں زیادہ صحیح طور پر پچاس سالہ مرد قرار دیا جاسکتا ہے!

فرزان — میں وہاں جانے کے لئے بیتاب ہوں۔ کیا وہاں لفظ "حسن" کبھی سننے میں آتا ہے — اور کیا وہاں کچھ فن کار لوگ موجود ہیں؟

مجسمہ — یقین کرو کہ اگر ایک بہترین مجسمہ جنت کے باشندوں کے قریب سے ٹہلتا ہوا بھی گزر جائے تو اس وقت بھی وہ لوگ اس کی تعریف نہیں کریں گے

فرزان — تو میں جاتا ہوں

ابلیس — فرزان — کیا میں بے تکلفی سے کچھ کہوں؟

فرزان — تو کیا اس سے پیشتر تم بے تکلفی سے بہت کچھ نہیں کہ چکے؟

ابلیس — جو کچھ میں نے کہا وہ بے شک بے تکلفی سے کہا تھا لیکن اب میں کچھ اور آگے کہنا چاہتا ہوں اور تمہارے سامنے یہ اعتراف کرتا ہوں

کہ انسان ہر چیز سے اکتا جاتا ہے۔ وہ جنت سے بھی اسی طرح گھبرا جاتا ہے جس طرح کہ دوزخ سے۔ اور انسان کی تمام تاریخ

ان ہی دو انتہاؤں کے درمیان مسلسل تغیر و تبدل کی روداد ہے۔ ہر ایک زمانہ گھڑی کے پنڈولم کی ایک حرکت ہے۔ اور ہر ایک نسل

انسانی صحن پر دیکھ کر کہ دنیا بھی ہمہ وقت حرکت میں ہے یہ خیال کرتی ہے کہ دنیا آگے بڑھ رہی ہے۔ لیکن جب تم اس قدر عمر کو پہنچو گے

جتنی کہ میں رکھتا ہوں — جب تم جنت سے ہزاروں مرتبہ اسی قدر اکتا چلو گے جتنا کہ میں یا کپتان صاحب بھگت چکے ہیں — اور جب

تم ہزاروں مرتبہ جہنم سے بھی اسی قدر اکتا جاؤ گے جیسے کہ اب نظر آتے ہو تو اس وقت تم اس فریب خیال میں مبتلا نہ ہو سکو گے کہ جنت سے

جہنم کی طرف انسان کی ہر ایک زقند ایک نجات اور جہنم سے جنت کی طرف ہر انسانی سعی و حرکت ایک ارتقائی اقدام ہے۔ جس جگہ تمہیں

اب اصلاح — ترقی — صعودی رجحان کی تکمیل و تسکین اور انسان کی وہ مسلسل جدوجہد نظر آتی ہے جو وہ خود اپنی مردہ زندگیوں کے زینے

پر بند تر مقامات تک چڑھ جانے کے لئے کرتا آیا ہے اُس جگہ تمہیں اگر کوئی شے ملے گی تو صرف ایک لامحدود فریب خیال و نظر تمہیں اس وقت

اس قول کی تصدیق ہو جائے گی کہ دنیا میں کوئی شے نئی نہیں — — — — —

فرزان — (بالکل بے تاب ہو کر) بخدا تمہارے یہ الفاظ تو اُس منافقانہ تقریر سے بھی خراب ہیں جو تم نے حسن و محبت کی شان میں کی ہے۔ بڑے

چالاک ہو تم! — اگر انسان ہر چیز سے سیر ہو کر اکتا جاتا ہے تو کیا محض اس وجہ سے یہ کہا جاسکتا ہے کہ انسان ایک کیرٹے سے برتر

نہیں یا ایک کتا ایک بھیڑے سے بہتر نہیں؟ — کیا انسان ایک کیرٹے سے برتر نہیں یا ایک کتا ایک بھیڑے سے بہتر نہیں؟ — کیا انسان

محض اس وجہ سے غذا کھانا ترک کر دے کہ وہ اپنی بھوک کو تسکین دینے کی کوشش میں اس بھوک کو تباہ کر لیتا ہے؟ اگر ایک کھیت

غیر مزوہ پڑا ہوا ہے تو کیا اس کی محض قوت بالکل بے عمل رہتی ہے؟ کیا یہ ممکن ہے کہ ہمارے کپتان صاحب یہاں اپنی جہنی قوت

کو صرف کریں اور آئندہ مبارک فردوسی کے زمانے کے لئے فردوسی قوت اُن کے اندر مجتمع نہ ہو جائے؟ میں تسلیم کرتا ہوں کہ ہماری غلط فہمی "قوت حیات" نے اپنے مقصد کے لئے گھڑی کے موجد والی پنڈولم کی تدبیر اختیار کی ہے اور یہ کرۂ ارض اس پنڈولم میں لٹکا ہوا دھننی گولہ ہے "قوت حیات" اس طرح ایک زبردست پنڈولم کی طرح کرۂ ارض کو لئے ہوئے ایک حد سے دوسری حد تک بار بار حرکت کرتی رہی ہے۔ اس پنڈولم کی ہر ایک حرکت کی تاریخ ہم انسانوں کو جو کہ اس تاریخی تمثیل کے اداکار ہیں بالکل نئی معلوم ہوتی ہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ یہ تاریخ اس پنڈولم کی سابقہ حرکت کی پُرانی تاریخ ہے جو اب دہرائی جا رہی ہے۔ اور صرف اتنا ہی نہیں بلکہ جس طرح کسی سرکس کا بازیکر ایک گیند کو بار بار اُچھال کر دبوچ لپٹا ہے اسی طرح وقت کی ناقابل قیاس لاہائیت و وسعتوں میں سورج ہزاروں مرتبہ زمین کو پھینکتا رہا اور پھر دبوچتا رہا ہے اور ہمارے طول طویل زمانے اس پھینکنے اور دبوچنے کے درمیان واقع ہونے والے محض لمحات ہیں۔ لیکن کیا اس عفریت نام نظام کے پس پشت کوئی مقصد کار فرما نہیں؟

ابلیس — کوئی بھی مقصد نہیں میرے دوست — تم سوچتے ہو کہ چونکہ تم ایک مقصد رکھتے ہو اس لئے فطرت کا بھی کوئی مقصد ضرور ہوگا۔ حالانکہ سوچنا تو ایسا ہی ہوگا جیسے تم یہ کہو کہ چونکہ تم ہاتھ پاؤں میں انگلیاں رکھتے ہو اس لئے فطرت کو بھی ایسی ہی انگلیاں حاصل ہونی ضروری ہیں۔

فرزان — لیکن اگر ان انگلیوں کا کوئی مقصد نہ ہوتا تو یہ کبھی مجھے نہ ملتیں — اور میرے دوست میں فطرت کا بالکل ایسا ہی ایک حصہ ہوں جیسا کہ میری انگلی میرا ایک حصہ ہے۔ اگر میری انگلیاں ایک ایسا آلہ ہیں جس کے ذریعہ میں شمیر و باب کو اپنی گرفت میں لے سکتا ہوں تو یقیناً میرا دماغ ایک ایسا آلہ ہے جس کے ذریعہ قدرت خود اپنی ذات کی حقیقت کو سمجھنے کی کوشش کرتی ہے۔ میرے کتے کا دماغ صرف میرے کتے کے مقاصد کی تکمیل کرتا ہے لیکن میرا دماغ ایک ایسے علم کے لئے محنت و مشقت کرتا ہے جو ذاتی طور پر میرے واسطے کچھ کرنے کے بجائے میرے جسم کو میرے لئے تکلیف دہ بنا دیتا ہے اور انحطاط و موت کو میرے واسطے ایک تباہی کی شکل دیتا ہے۔ اگر میرا مقصد میری ذات سے ماوراء نہ ہوتا تو میں ایک فلسفی کے بجائے ایک کسان بننے کو ترجیح دیتا — کیونکہ — کسان اتنی ہی مدت زندہ رہتا ہے جتنا کہ ایک فلسفی — بلکہ یوں کہو کہ وہ فلسفی سے زیادہ ہی عمر پاتا ہے — زیادہ کھاتا ہے — بہتر نیند سوتا ہے اور اپنی شریک حیات کے آغوش محبت سے کسب کیمت و مسرت کرنے میں اس کا دماغ فلسفی کی طرح شکوک و شبہات سے منفصل نہیں ہوتا۔ فلسفی اس قدر مختلف کیوں ہے؟ — صرف اس لئے کہ وہ "قوت حیات" کی گرفت میں ہے! — "قوت حیات" اس سے کہتی ہے "میں زندہ رہنے کے صرف ارادہ کے ذریعہ اور قلیل ترین دشواری کے راستوں کو اختیار کر کے غیر شعوری طور پر ہزاروں حیرتناک کارنامے کر چکی ہوں۔ اب میں چاہتی ہوں کہ خود اپنی حقیقت اور اپنی منزل مقصود کو معلوم کر دوں اور اپنا راستہ انتخاب کر دوں۔ اسی مقصد کے لئے میں نے ایک خاص دماغ تخلیق کیا ہے — ایک فلسفی کا دماغ — تاکہ یہ فلسفی میرے لئے اس عرفان ذات پر اسی طرح گرفت حاصل کرے جیسے کہ ایک کسان میرے واسطے اپنے ہل کو گرفت میں لے لیتا ہے — اور یہ وہ کام ہے اسے فلسفی جس کے لئے تجھے جدوجہد کرنا ہی ہوگی اُس وقت تک کہ تو مر جائے! — تیری موت کے بعد اس کام کو جاری رکھنے کے لئے میں ایک اور دماغ اور ایک اور فلسفی بناؤں گی۔"

ابلیس — لیکن اس عرفان و علم سے فائدہ ہی کیا؟

فرزان — فائدہ یہ ہے کہ قلیل ترین دشواری کی سمت جھکنے کے بجائے کثیر ترین مفاد کے راستے کو انتخاب کرنے کی اہلیت نصیب ہو جائے کیا ایک جہاز کا اپنی مقررہ و متعین منزل کی طرف رواں ہونا ایک ادھر ادھر پھٹکتے ہوئے لکڑی کے تختے سے بہتر نہیں ہے؟ — فلسفی فطرت کے جہاز کار رہتا ہے — اور یہی وہ فرق ہے جو مجھ میں اور تم میں حایل ہے — دوزخ میں رہنا لکڑی کے تختے کی طرح بھٹکنا ہے۔ اور جنت میں رہنا ایک جہاز کی طرح خود راستہ پیدا کرنا۔"

ابلیس — لیکن یہ راستہ اغلب یہ ہے کہ جہاز کو چٹانوں کی طرف لیجائے گا۔

فرزان — چٹانوں کی طرف یا سمندر کی تہ میں کوئی جہاز زیادہ تر جاتا ہے؟ — بھٹکنے والا جہاز یا وہ جہاز جس پر ایک رہنما موجود ہے؟

ابلیس — اچھا اچھا! — آپ اپنے راستہ پر بڑھے چلے جائیے فرزان صاحب! — میں تو اپنی ذات پر خود اپنا اختیار قائم رکھنے کو ترجیح دیتا ہوں

اور کسی غلط کار کا 'سناٹی قوت' کا آلہ کار بننا پسند نہیں کرتا۔ میں جانتا ہوں کہ حسن نگاہوں کی مسرت ہے۔ موسیقی سماعت کا سرور ہے۔

محبت احساس کی جنت ہے اور یہ تمام چیزیں ہمارے خیالات و الفاظ کے واسطے ایک دلچسپ مواد مہیا کرتی ہیں۔ میں جانتا ہوں کہ ان

احساسات۔ ان جذبات اور ان مشاغل میں منہمک ہونے سے ہی ایک مہتی پاکیزہ مذاق اور شستہ و مہذب پہلا سکتی ہے۔ کردہ ارض

پر معاہدے کے اندر مجھے لوگ خواہ کچھ بھی کیوں نہ کہیں میں جانتا ہوں کہ اعلیٰ سوسائٹی کے اندر تمام دنیا میں "شہزادہ ظلمت" کو ایک

شریف و معزز شخصیت سمجھا جاتا ہے۔ اور میرے لئے بس اتنا ہی کافی ہے۔ رہا تمہاری اس "قوت حیات" کی بابت جسے تم بل پناہ

اور ناقابل مزاحمت خیال کرتے ہو تو واقعہ یہ ہے کہ میرے خیال میں ہر ایک معمولی کردار کے انسان کے لئے یہ قوت دنیا بھر میں سب سے زیادہ

قابل مزاحمت چیز ہے۔ لیکن اگر تم ایسے ہی پست مذاق اور سربلایا اعتقاد ہو جیسا کہ دنیا کے تمام مصلحین ہوتے ہیں تو اس صورت میں

یہ "قوت حیات" پہلے تو تمہیں کسی مذہب کے حدود میں ڈھکیلتی ہوئی لیجائے گی جہاں تم شیرخوار بچوں کی روح کو مجھے بچانے کے لئے

ان پر مقدس پانی چھڑکو گے۔ اس کے بعد یہ قوت تمہیں مذہب کی طرف سے ہانکتی ہوئی سائنس کی طرف لیجائے گی جہاں تم شیرخوار

بچوں کو مقدس پانی کے چھینٹوں سے دور کھینچ کر لیجاؤ گے اور ان کے جسم میں ٹیکہ کی شکل میں بیماری کے جراثیم صرف اس لئے داخل کرو گے

کہ یہ بیماری ان کو محض اتفاقیہ نہ لگ جائے۔ اس کے بعد تم سیاسیات میں داخل ہو گے جہاں تم بد اخلاق عالمین کے آلہ کار اور

لمذ حوصلہ فریب کار کھوکھلی شخصیتوں کے دست راست بن جاؤ گے۔ اور اس سب کا انجام ہوگا مایوسی اور اپاہج بڑھاپا۔

مفلوج قوت اور شکستہ امیدیں۔ شدید پشیمانی و افسوس دنیا کی بدترین اور احمق ترین بربادی و قربانی پر۔ یعنی اہلیت خطا اندوزی

کی بربادی و قربانی! — یا مختصر الفاظ میں یوں سمجھو کہ عمدہ شے "پر قابو پانے سے پہلے" عمدہ ترشے" کے تعاقب میں دوڑ جانے والے

احمق کو جو سزا ملنی چاہئے وہ تمہارا حصہ ہوگی۔

فرزان — لیکن کم از کم میں کوفت سے تو محفوظ رہوں گا۔ "قوت حیات" کی خدمت کرنے میں اس قدر فائدہ تو بہر حال ہوتا ہی ہے۔ اس لئے

الوداع ابلیس صاحب!

ابلیس — (زخمی سے) الوداع فرزان! — مجھے اکثر وہ دلچسپ گفتگو یاد آیا کرے گی جو تم عام امور کی بابت کرتے رہے ہو۔ میری تمنا

ہے کہ تم ہر ایک مسرت سے بہرور ہو سکو۔ جیسا کہ میں نے پہلے کہا ہے جنت کچھ لوگوں کو اس بھی آجاتی ہے۔ لیکن اگر کبھی تمہاری رائے

تبدیل ہو جائے تو اسے یاد رکھو کہ تائب مغرورین کے لئے یہاں دوزخ کے دروازے ہمیشہ کھلے رہتے ہیں۔ اگر کسی وقت بھی تمہیں

اپنے اندر ایسی چیزوں کا احساس ہو جیسے گرجی قلب۔ پر خلوص بے اختیار محبت۔ معصوم خطا اندوزی۔ اور گرم دھڑکتی ہوئی اور

مانس لیتی ہوئی حقیقت۔۔۔۔۔

فرزان — یعنی مختصر یہ کہ گوشت و پوست! — ان تمام الفاظ کے بجائے صراحتاً گوشت و پوست کیوں "کہا جائے"۔ واقعہ ہے کہ ہم ان

دونوں عامیانه گندی چیزوں کو بہت پیچھے چھوڑ آئے ہیں؟

ابلیس — (غصہ سے) تو اس کے معنی یہ ہیں کہ میں تمہیں واپسی کی دعوت جو دے رہا ہوں اسے تم واپس میرے منہ پر پھینکنا چاہتے ہو؟

فرزان — ہرگز نہیں۔ لیکن یہ واقعہ ہے کہ اگر ابلیس محض ایک قنوطی شخصیت کا مالک یا ایک سائنٹفک ہو تو میں اس سے بہت کچھ استفادہ

کے لئے تیار ہوں مگر ایک جذباتی ابلیس کا وجود میری سمجھ میں نہیں آتا۔ کپتان صاحب! آپ دوزخ و جنت کی سرحد کا راستہ

جانتے ہیں۔ براہ کرم میری رہنمائی کیجئے۔

آزاد فکارت

آرٹ اور ثقافت کی آزادی کے متعلق اتنے متضاد نظریات اور تصورات پیش کئے گئے ہیں کہ ان مسائل سے متعلق جو بحثیں کی جاتی ہیں وہ جلد ہی سیاسی رنگ اختیار کر لیتی ہیں۔ اور ان کا مقصد محض یہ رہ جاتا ہے کہ کسی خاص سیاسی نظریے کی تائید میں دوسرے تمام سیاسی نظریات کی تنقیص کی جائے اس لئے یہ ضرورت سمجھی گئی کہ آزاد فکارت کی خصوصیات واضح کر دی جائیں۔

وہ کیا چیز ہے جو ایک فکارت کو آرٹ کی خدمت پر ابھارتی ہے وہ اس کی انانیت ہے، اس کے نظام فکری کا ایک فطری زور ہے، اس کی عظیم انفرادیت کا ایک برجوش اثبات ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آرٹ کے تمام آزاد شہپارے اپنی خالق کی عظیم شخصیت، کاحسین پر تو ہوتے ہیں، پس اگر اسکی انانیت آزاد ہے، اسے پھیلنے پھولنے اور اپنے وجود کا اثبات کرنے کے مواقع میسر ہیں تو اس کا آرٹ بھی آزاد ہے۔

یہ نہ سمجھئے کہ نظام کائنات کو انسانوں سے کوئی ہمدردی ہے۔ وہ تو بڑا ہی بے دردا اور ظالم ہے اس کو شخصیت کے ارتقا سے نہ صرف یہ کہ کوئی دلچسپی نہیں بلکہ وہ اس کا سختی سے مزاحم بھی ہوتا ہے۔ شوپنہار اور عمر خیام اس کے آگے سپرد اٹنے ہی میں اپنی خیر سمجھتے ہیں، کائنات کا زبردست ہاتھ انھیں اٹھا کر پھینک دے، کچل دے، دبا دے، انھیں کوئی شکوہ نہیں، دن اور رات سے بنی ہوئی شطرنج کبھی ہوتی ہے اور کوئی نامعلوم اور زبردست ہاتھ انھیں اپنی مرضی کے مطابق چلاتا رہتا ہے، کیونکہ ان کے خیال میں اس سے مقابلہ کرنا بے سود ہوگا۔ لیکن حقیقت یہ نہیں ہے، نظام کائنات کو مفتوح کیا جاسکتا ہے، انسان عظیم تر ہے، خواہ کتنی ہی مدت صرف ہو لیکن انسان اسے مغلوب کر کے رہے گا۔ نقطے اسے مغلوب کرنے والی قوت کو جو انسان کے اندر خوابیدہ پڑی رہتی ہے، زور زندگی کا نام دیتا ہے۔ یہ زور زندگی آزاد فکارتوں کی انانیت کی ارتقائی شکل کا دوسرا نام ہے۔ اسی لئے ایک فکارت اپنی انانیت اور اپنی عظیم انفرادیت کے اظہار پر مجبور ہوتا ہے، یہی اسے آزاد شہپاروں کی تخلیق پر ابھارتا ہے اور اس طرح کائنات مجمل (فکارت کی شخصیت) کائنات مفصل سے برسر پیکار ہوتی ہے، اور مسلسل کوشش کرتی رہتی ہے کہ اسے محکوم کر لے۔ ایک فکارت کی انانیت جو کبھی پتھروں کو احساس بخشی ہے، کبھی تصویر کے روپ میں ظاہر ہوتی ہے، کبھی شعر رنگین کا جامہ پہنتی ہے، کبھی آتشیں تقریر کی صورت میں اپنی ہمتی کا اثبات کرتی ہے، کبھی نغمہ فصول خیز کی خالق ہوتی ہے، ارتقا کے مختلف مدارج نظام کائنات اسے تھپکیاں دیکر سلانے کی کوشش کرتا ہے، سیاسی نظریات اس پر زریں کپڑے مٹی تھیں لپیٹ کر اس کی آواز کو دبانے کی کوشش کرتے ہیں، ہمارا آزادی کش ماحول اسے گیلنے کی فکر میں لگا رہتا ہے لیکن ان تمام بندشوں اور رکاوٹوں کے باوجود فضا بے بسیط میں ایک بے اختیار چیخ بلند ہوتی ہے جو نظام کائنات کو ہلا دالتی ہے، جو صرف حال پر ہی محیط نہیں ہوتی بلکہ مستقبل کا بڑا حصہ بھی اس کے اختیار میں آجاتا ہے اور اسی بے اختیارانہ چیخ کو آزاد شہپارے کا نام دیا جاتا ہے۔

آزاد فکارت کی فطری صلاحیتوں کو ابھرنے سے روکنے والے عناصر میں سب سے پہلے مذہب کی باری آتی ہے۔ مذہب اپنے بلند مقبوم میں انفرادیت کے اظہار پر کوئی قابل اعتراض پابندی نہیں لگاتا۔ اس کی پابندی صرف اس حد تک ہوتی ہے کہ آرٹ کا نمونہ خدا کی حاکمیت سے انکار کا مدعی نہ ہو۔ یہاں تک آزاد فکارت کی شخصیت کو کوئی نقصان نہیں پہنچتا، بلکہ ایک حد تک خدا کی ربوبیت کا صحیح تصور اسے دوسری زنجیروں میں مقید ہونے سے روکتا ہے۔ لیکن آج کل جب کہ مذہب رسوم اور خود ساختہ فروعی عقاید کا مجموعہ بن کر رہ گیا ہے، اظہار جذبات ہر مذہب کے علم بردار بڑی بندشیں لگاتے ہیں۔ ہماری تہذیب اور معاشرت نے کچھ ایسا رجحان اختیار کر لیا ہے، گویا وہ خدائی احکام کی طرح قائم و دائم ہیں، نہ ان میں زیادتی کی گنجائش ہے نہ کمی کی، مروجہ طرز معاشرت اور موجودہ تہذیب اپنے خلاف کوئی آواز نہیں سن سکتی،

حالانکہ وہ تہذیب کو زیادہ مکمل اور زیادہ شاندار بنانے کے لئے بلند کر جاتی ہے۔ بہت سے فنکار اسی معاشرتی احتساب کی وجہ سے بہت دھیمے سروں میں لاپتے ہیں ان کے نعمات میں وہ گونج نہیں پیدا ہو جاتی جو آفاق کی پہنائیوں میں پھیل جائے۔

موجودہ سیاسی نظام، جو اقتصادی بنیادوں پر قائم ہونے کی وجہ سے دو خاص گروہوں میں منقسم ہے (یعنی سرمایہ داری اور اشتراکیت انفرادیت کی نمود کو مختلف ڈھنگوں سے روکتا ہے۔ ان ممالک میں جہاں سرمایہ دارانہ نظام حکومت ہے، طرح طرح کی احتسابی قوتیں موجود ہیں جن میں سے کچھ بلا واسطہ کام کرتی ہیں کچھ بالواسطہ۔ تمام ذرائع پیداوار سرمایہ دار اور بورژوا طبقہ کی ملکیت میں ہونے کی وجہ سے وہی ادیب پنپ سکتا ہے جو بورژوا قدروں کے گیت گائے۔ الغرض معاشرت کے سارے شعبوں میں بورژوائی رجحانات کی حکمرانی ہوتی ہے۔ اگر کوئی فنکار ان رجحانات کی ترجمانی نہیں کرتا تو لوگ ایک ناگوار تاثر کے ساتھ اس کی تصنیفات کا مطالعہ بند کر دیتے ہیں۔ سرمایہ دار لوگوں کے دماغوں کو سلانے کی خاطر ایسی تصنیفات کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں جو زندگی کے متعلق خوبصورت جھوٹ پیش کریں۔ ادیب اور مصور ایسے ناول اور راگ تصنیف کرنے مجبور ہو جاتے ہیں، جس کی بازار میں مانگ ہو تاکہ اس طرح اپنی مالی حالت درست کر سکیں بصورت دیگر وہ ایسے چھپچھورے افسانے اور اشعار ایسے عامیانہ گیت اور ایسے آزاد آرٹ سے معرا اصنام کی تخلیق کبھی نہ کرتے اس کے علاوہ ایسے ممالک میں براہ راست سنسر شپ کا طریقہ ہوتا ہے اگر کوئی فنکار ایسی تخلیق کرتا ہے جس سے اس کی پرورش انانیت گروہ پیش میں ایسی گونج پیدا کر دے جو سوتے ہوئے عوام کی انفرادیت کو جگادے تو اس کی تخلیق ضبط کر دی جاتی ہے اور پھر اس کے لئے جیل کے دروازے یا فاقوں کے راستے کھلے ہوئے ہیں۔

اشتراکی نظام کے متعلق تو کچھ کہنا ہی بیکار ہے۔ وہ تو ایک پل سراط ہے جو تلوار سے تیز تر تو نہیں، مگر بال سے باریک ضرور ہے۔ اگر کوئی ماضی کے گھنڈروں کی طرف نظر محبت ڈالتا ہے تو اس پر رجعت پرستی کا یسبل چپکا دیا جاتا ہے، حالانکہ وہ اس کے اجداد کی عظمت کے نشان ہیں۔ میں نے ہیلو وود کی فلم ”کریلین کا انسان“ پڑھی۔ ذہنی مرعوبیت اور فکری غلامی کی اس سے بدتر مثال شاید ہی کہیں مل سکے۔ پتہ نہیں لپٹن کو روسیوں نے جیت پسند کیوں نہیں کہا۔ اس کی آزاد زندگی تو اس سے بھی ”بدتر“ خطاب کی مستحق تھی۔ اس کے علاوہ طبقاتی تعصب، جو اس نظام کی خصوصیتوں میں سے ایک ہے، ایک فنکار کے آزاد میلانات کو سختی سے گچل دیتا ہے۔

اس سے پہلے ذکر آچکا ہے کہ ایک فنکار کی انانیت مختلف ارتقائی مدارج رکھتی ہے۔ چنانچہ مذکورہ بالا زنجیریں فنکار کو ایسا مقید کر دیتی ہیں ہیں کہ مجال دم زدن نہیں رہتی کسی کو خوابیدہ کر دیتی ہیں۔ پھر کسی فنکار کی انانیت ایسی ہوتی ہے کہ وہ اپنا اظہار دھیمے سروں میں کرتی ہے، کبھی اس کی لئے اتنی بلند اور گونجنے والی ہوتی ہے کہ عوام کی خوابیدہ انانیت جاگنے لگتی ہے۔ ماحول کی مشکلات ان پر کوئی اثر نہیں کرتیں۔ آزاد فنکار یا تو نتائج سے بے پروا ہو کر ان بندشوں کو توڑ دینے کی کوشش کرتا ہے، یا انھیں نظر انداز کر دیتا ہے۔ موزرٹ نے جونہی آزاد راگ تصنیف کرنے شروع کئے، اس کی آمد فی ختم ہو گئی، وہ سردی کے دنوں میں اپنی بیوی کے ساتھ قصص مڑا رہا تھا۔ اس لئے نہیں کہ اپنے نفس کو آسودہ کرے، بلکہ اس لئے کہ اپنے جہم میں کام کرنے کے لئے گرمی پیدا کرے اور مصائب کی اسی حالت میں اس نے اپنے مشہور ترین شاہکار تخلیق کئے ۱۸۰۹ء میں جب موت کے فرشتے ہیڈن کے سر پر منڈلا رہے تھے، فرانسیسیوں نے ویانا پر بمباری کی، اس کے نوکر ڈر گئے اور ان کی رگوں پر اضمحلال چھا گیا مگر ہیڈن کی روح جادہ سکون سے نہ ہٹی۔ موت سے کچھ دیر پہلے اس نے کہا کہ اسے پیانو کے پاس پہنچا دیا جائے، اس کی زرد انگلیاں پیانو پر تیزی سے چلنے لگیں، ایک دھیماسا افسردہ راگ نکلا اور اس نے اپنا شاہکار ”آسٹریائی نغمہ عبادت“ بجایا، وہ بجاتا رہا تاکہ اس کی انانیت کی چیخ جنگ کے دھماکوں پر غالب آجائے۔ پھر ایسا نہ ہوا، تین مرتبہ اس نغمے کے بجنے کے بعد موت نے اسے سیاہ پردوں میں چھپا دیا۔ ویانا کے ایک دوسرے کونے میں تھوڑے دن اپنے کانوں میں روئی ٹھونے بیٹھا تھا، تاکہ اس کا ذوق لطیف بھدی آوازیں سن سن کر مردہ نہ ہو جائے، لیکن وہ بہرا ہو گیا اور اس طرح وہ خود اپنے ہی نغمے نہ سن سکا۔ یہ دونوں جنگ کی ہولناکیوں کو نظر انداز کرتے رہے اور ایسی شکست کھائی جس پر ہزار فحش قربان ہیں۔ انھوں نے اپنی عظیم انفرادیت کو دہنے نہ دیا اور آخری وقت تک آزاد آرٹ کی تخلیق کرتے رہے، پھر جب وینس کی حکومت نے مشہور مصور، سنگتراش، مور زگر آندر یا زیل وراکشو کو فلورنس سے بلوایا تاکہ وہ ایک مشہور جنرل کا لیانی کی یادگار قائم کرے اور جب وہ وینس

(حالانکہ اگر ان کی امانیت بھی جاگتی ہوتی تو ایک عظیم راز کے انکشاف کے روپ میں زور شور سے اُچھلتی ہوئی باہر نکلتی ہے۔) فرق صحت اتنا ہے کہ بہت سے فنکار غیر متعلق راہیں اختیار کر لیتے ہیں اور بہتوں کی چٹخیں ایک ہی مقصد کے لئے بند ہوتی ہیں۔ پہلی قسم کے فنکاروں کی امانیت پر جوش نہیں ہوتی بلکہ رینگنے والی ہوتی ہے، یہی وجہ ہے کہ لوگ ان کی بھی ہوئی سب باتوں کو بھول جاتے ہیں۔ کوئی آدمی ایک ہی فنکار سے منسوب کردہ مختلف اور متضاد نظریات کو یاد نہیں رکھ سکتا۔ ہاں دوسری صورت میں جبکہ فنکار اپنی بھی ہوئی ایک ہی بات کی تشریح کرتا ہے، تو اس کے نفوش زیادہ گہرے ہوتے جاتے ہیں اور ایسے ہی فنکاروں کو قبولیت عوام اور شہرت دوام نصیب ہوتی ہے۔ ان آزاد فنکاروں کو چھوڑ کر جن کی انفرادیت گرد و پیش کی پابندیوں کو نظر انداز کر دیتی ہے، آزاد فنکار کے ارتقاء کے لئے ضروری ہے کہ ایک ایسا نظام قائم کرنے کے لئے جدوجہد کی جائے جس میں پابندیاں نہ ہوں تاکہ ایسے فنکار بھی آزادانہ تخلیق کے عمل کو انجام دے سکیں جن کی امانیت زیادہ پر جوش نہیں ہے۔

جلیل عابدی

ایک قدیم کتب خانہ کی بعض نادر کتابیں

ترجمہ کلیات و معالجات پندرہ روپیہ
بحر محیط - حکیم اصغر حسین فرخ آبادی آٹھ روپیہ
تشریح کبیر - حکیم محمد کبیر الدین دہلوی بارہ روپیہ
کتاب التشنیص مکمل آٹھ روپیہ
اسرار حکمت - از حکیم محمد عبدالعزیز لاہوری چار روپیہ
طب کی فارسی کتابیں
قرا بادین کبیر مکمل سولہ روپیہ
مغربات فرنگی (از مہنری پریکٹر) سترہ روپیہ
مخزن الادویۃ مع تحفۃ المؤمنین - از حکیم محمد حسین علوی شیرازی دس روپیہ
محیط اعظم مکمل - از حکیم محمد اعظم خاں دہلوی پچیس روپیہ
اکسیر اعظم " " " پنیتیس روپیہ
مفرج القلوب - مفید الاحسام (علم جراحی) بارہ روپیہ
علاج الامراض از حکیم محمد شریف خاں دہلوی آٹھ روپیہ
مخزن اکسیر مکمل ۶ جلد از حکیم امام الدین پاک پٹن دس روپیہ
قرا بادین اعظم - از حکیم محمد اعظم خاں دہلوی پندرہ روپیہ
قرا بادین قادری - از حکیم محمد اکبر ازرائی بارہ روپیہ

غیاث اللغات مطبوعہ ۱۸۷۳ء (فارسی) چار روپیہ
سواطع الالہام از فیضی (عربی) سات روپیہ
فتح اللغات داراشکوہی (فارسی) سات روپیہ
علم جفر و شعبہ جات (اردو) چار روپیہ
شمس یوسف زلیخا جاتی (فارسی) تین روپیہ
مصدق الرمل، انوار الرمل (فارسی) سات روپیہ
مراثی انیس چھ روپیہ
نالہ عندلیب (فارسی) آٹھ روپیہ
ترجمہ حدائق البلاغت (اردو) تین روپیہ
علم الکتاب خواجہ درد (فارسی) چھ روپیہ
طب کی اردو کتابیں

ترجمہ کلیات نفیسی مکمل سولہ روپیہ
ترجمہ قانون بوعلی سینا مکمل تیس روپیہ
کنج حکمت مکمل ۱۳ حصے دس روپیہ
مخزن المفردات چار روپیہ
امراض چشم پانچ روپیہ

نگار بک ایجنسی لکھنؤ

وسط ایشیا کی جدید شاعری کے نمونے

دماغوں پر صدیوں سے تالے پڑے ہوئے تھے لیکن انقلاب کے ہموڑے نے دفعتاً وہ تالے توڑ ڈالے اور ایک تاجیک دہقان منور شاہ زندگی پر ان لفظوں میں تنقید کرنے لگا:-

”جنگ ہو رہی تھی اور میں قلعہ کی دیوار کے نیچے کی سڑک پر چلا جا رہا تھا۔ گرمی سخت تھی اور غبار چھایا ہوا تھا۔ میرے پاؤں میں سکت نہ رہی تھی کہ دھان کے کھیتوں میں گھس جاؤں جہاں اگرچہ لاشیں سڑ رہی تھیں مگر ایک گھوڑے سوار سے چھپنا بھی چاہتا تھا۔“

”شکستہ حجرے سے میرے بوڑھے استاد برآمد ہوئے جنھوں نے مجھے کچیس سال پڑھایا تھا۔ علم و فضل کی پوٹ، ملا صاحب فرماتے ہیں:-

”میری بات پر دھیان دو! میرے لفظ یاد رکھنا!“

”میں نے جواب دیا: ملا صاحب! مجھے آپ کی پہلی سب باتیں یاد ہیں، آپ نے فرمایا تھا آج ہمیشہ سلامت رہے گا۔ مگر وہ تاج ریزہ ریزہ ہو گیا آپ نے کہا تھا تخت کو شکست نہیں ہوگی مگر وہ تخت پاش پاش ہو گیا! آپ کا فرمان تھا کہ بادشاہ کا خون حرام ہے! مگر وہ خون میری تلوار پر جا ہوا ہے! آپ کا ارشاد تھا کہ قرآن کا حکم اٹل ہے، عورتیں پردے میں رہیں گی۔ مگر عورتوں نے برقعے جلا ڈالے! آپ فرماتے تھے کہ اسلام کا بول بالا ہو گا اور مسجدیں آباد رہیں گی مگر مسجدیں تو اب برائے نام آباد ہیں! آپ کا کہنا تھا کہ خان و ملا بے اور سوداگر ہمارے ملک کے آقا ہیں، مگر آج وہ سب معدوم ہیں! استاذی! آپ کی ساری پیشین گوئیاں جن کے خیال سے بھی منلی ہوتی ہے کیا ہوئیں!“

ایک دوسرا ازبکستانی دہقان شاعر لینن پر اپنی نظم میں کہتا ہے:-

”جڑ میں پانی پہنچتا رہے تو سفیدار کے درخت پہاڑی سے بھی اونچے نکل جاتے ہیں! ریگستان کی ساری ریت اور پامیر کے ٹیلا بھی سمندر کو نہیں پاٹ سکتے۔“

”ہولناک جرم کر کے یا بڑی خیرات کر کے آدمی لوگوں کو اپنا نام یاد کروا دے سکتا ہے، کریمہ جبرائیم کو دیکھ کر دنیا اکثر زلزلہ مٹی ہے، لیکن نیک عمل انسان چند ہی ہوتے ہیں!“

”پامیر کی چوٹیاں زمیں دوز ہو جائیں، ساری دنیا سمندر بن جائے، اور پھر پامیر سے دس گنا اونچے پہاڑ کھڑے ہو جائیں، مگر زمانہ کی آہنی رفتار نہیں رُک سکتی!“

”انسان اپنے بزرگوں کو بھلا دے سکتا ہے، اپنی مادری زبان کو بھی فراموش کر دے سکتا ہے لیکن وہ لینن کا نام فراموش نہیں کر سکتا! سب سے بڑے انسان کا نام بھلایا نہیں جاسکتا! کیا لینن نے جنگ کو فوراً نہیں روک دیا؟ کیا اس نے ہمارے آئینہ نہیں پونچھے؟ کیا اس نے اپنی روح کی کمرزوں سے ہمارے دلوں کو نہیں گرہ لایا؟ اور کیا اس نے انسانیت کی چونک یعنی زمینداروں کو فنا نہیں کر دیا؟

”ہم نہیں جانتے کہ لینن میں بے پناہ طاقت کہاں سے آئی، ہماری کمزور نظریں اس عظیم شخصیت کی روح کو نہیں دیکھ سکتیں، ہم صرف آنا جانتے ہیں کہ دنیا نے اس سے زیادہ بڑے دل و دماغ کا انسان پیدا نہیں کیا!“

”ہم جی رہے ہیں، اس لئے جیتے ہیں کہ اس عظیم الشان مہر و کی ذات سے حقیر سی مناسبت پیدا کر لیں!“

شاعر سلیمانی، اصلاح و تعمیر کے دور میں رجعت پرست عناصر کی تصویر اس طرح کھینچتا ہے:-

ایک جماعت — ہم مورچے پر جا رہے ہیں، جنگی مورچے پر، برقعہ و چادر کے خلاف جنگ کرنے جا رہے ہیں! ہماری سرحد پر بننے والا مشرق کس نے!

ہم اپنی بہنوں اور بچیوں کی زندگی اور آزادی کے لئے جنگ کر رہے ہیں !
 دوسری جماعت - مگر جیتی تو دنیا کے چھوڑ تک جا کر بھی برطانوی جھنڈا اٹھالیتے ہیں ! اور ہمارے بھائیوں کو قتل کر کے خون کی ندیاں بہاتے ہیں
 ان آنکھوں کو سوند دیتے ہیں جو ان کی کمینگی کی شاہد ہیں !
 پہلی جماعت - چین ! ہندوستان ! ہم تمہیں آزادی دلانے کو لڑ رہے ہیں !
 دوسری جماعت - لیکن چین و ہند تو سامراج کے لئے پلاؤ کی قاب ہے !
 پہلی جماعت - اب ہمارے یہاں امیر و ملا اور بے کے لئے ٹھکانا نہیں رہا ! جس خدا کے خدمت گار ایسے ہوں اُس خالی ضرورت سے مانہیں !
 دوسری جماعت - ملا و امیر نے تو زمین کے پورے گربے کا بوجھ غریب کی خمیدہ کمر پر لا دیا تھا ؟ ہندو کسان کے بچے کا بکسوں میں خون کتے !
 پہلی جماعت - یہی ہمارے انسانوں کے لئے نئی دنیا کا دروازہ کھول رہے ہیں !
 دوسری جماعت - تمہارے ہمارے گردنوں پر اپنا جوالادے رکھنا اور گولی گولے کا تاشا دکھانا جانتا ہے !
 دونوں جماعتیں ملکر - وراہہ سنا ہے اور سورج طلوع ہو رہا ہے ! ہم کہتے کہ نیک و بد کو پہچانو اور رشتہ کر دو !
 "اجکستانی شاعر لائوتی کا شمار صرف سوویٹ یونین ہی میں نہیں بلکہ ساری دنیا کے چڑ بھند پا۔ غزوں میں سے کیا جاتا ہے۔ سوویٹ یونین میں اس کی مقبولیت کا یہ عالم ہے دورِ فتادہ دیہاتی علاقے بھی اسے دعو کرتے اور اس کے لئے آنکھیں بچھاتے ہیں۔ لائوتی اپنی ایک نظم میں بادشاہ سے مکالمہ کرتے ہیں :
 شاہ نے کہا : دو حقیقتوں کی جنگ منشاء رسانی ہے : تم روٹی کے لئے فضول دھو رہے ہو۔ دنیا میں امیری و غریبی، تو نگری و محتاجی، دونوں ضروری ہیں ! مقدر پر شکر واجب ہے ! - دنیا کے فاتح تو تم نے دنیا کو خون کے غسل دے ! - دنیا کے غریب تو تم نے دنیا کو روٹی کھلائی، شاہ شش !
 " میں نے بادشاہ کو جواب دیا : حق و کاذب بوڑھے تیری باتیں قابلِ غرت ہیں - ہر چیز دہقان و مزدور کے ہاتھ پیدا کرتے ہیں، انکی مشقت مقدس ہے ! - تیری گندی بکواس، تیرے ظلموں کی یہ دوکان، تیرے بھروسوں کا یہ کارخانہ اور ناپاکی کی یہ پکھال، تیرا سب کچھ چٹختی بند و قول کے گیت میں فنا ہو جائے گا ! اور یہ بند و قیں کسان و مزدور کے ہاتھوں میں ہوں گی - وقت آگیا ہے اور ہمارے بازو طاقتور ہیں ! - تمہاری خاک سے ایک بنا ذات پات کا سلج، ایک نئی دنیا پیدا ہوگی۔"
 لائوتی کی ایک دوسری نظم دستاویز ایشیا کی نئی اسپرٹ کی آئینہ دار ہے، جس کی صنف و پیکر بھی جدید ہے۔ اس پیکر کو سوویٹ ادب میں "رپوتاج" کا نام دیا گیا ہے۔
 سینٹرل کمیونسٹ پارٹی کے آرگن، اخبار پر اودا کو لائوتی نے ایک رپورٹ نظم میں بھیجی تھی :-
 "اجکستان میں تین کامرلک روز افزوں پھیلتا جا رہا ہے - آدمی سب بدل گئے ہیں، ہر شخص اشتراکیت کا محل کھڑا کرنے میں لگا ہوا ہے !
 خود بھی غلام زمیندار، کل تک جن لوگوں کو پاؤں تلے روندنا تھا، وہ عوام آج اشتراکیت کا محل چن رہے ہیں ! وہ عوام جو ملا کے جال اور پھندے میں پھنسے ہوئے تھے، حیرت ہے کہ کارنامے کر کے دکھا رہے ہیں !
 حلیمہ کل تک بادل کی کڑک سے آنکھیں میچ لیتی اور جی کی طرح کا پنے لگتی تھی، وہی حلیمہ آج علم و سائنس پر اتالی کر رہی ہے ؟ فطرت کی قوتیں اس کی فوٹریاں بن گئی ہیں اور اس کی نرم دناؤں کی انگلیاں ریڈیو سیٹ طیارہ کر رہی ہیں۔
 ترسون بھی حلیمہ سے پیچھے نہیں، لکڑی کے دقیاؤں سے ہل کو چھوڑ کر اب ترسون ٹریکٹر چلا رہا ہے، اس کے دماغ میں چل پیدا ہو گئی وہ ہر وقت اپج کی لینے لگا ہے - نئی نئی باتیں نکالتا ہے !

لے ان اشاروں سے پتا چلتا ہے کہ سوویٹ مشرق میں باقی ایشیا کی آزادی کے لئے کتنی تڑپ ہے۔ اور یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ اسلام دوسرے مذہب والوں کو لائیں سکھاتا۔ نیز اشتراکیت سچے انسانی بھائی چارہ کی تعلیم دیتی ہے۔

جن پگڈنڈیوں پر کل تک اونٹ اور خچر اونگھتے چلتے تھے، ان راستوں پر آج کار گزاریوں کے طوفان امنڈ رہے اور موٹریں اور ٹرک دوڑتے پھر رہے ہیں! نیچے ٹرک ہیں اور اوپر ہوائی جہاز!

بیکار ریگستان کی طرح کی بیکار باتیں اب سب مفقود ہیں، اب نہ وہ مشرقی غنودگی ہے نہ سمست رفتاری! اب وقت کا ہر لمحہ کام کا ہے اور تکیوں کا دور دورہ ہے!

سست قدم ہیں کے پیچھے گنگنا جانا، آنکھیں سوندھ کر پانیا چلانے والا، اور اونگھتے اونگھتے بونی کرنے والا، ترسوں آج غائب ہے تو تعجب کیوں ہو! آج کا ترسوں نہ معموم ہے اور نہ اونگھتا ہے، مشین کا موٹر اسے ہر وقت خوش اور چوکنا رکھتا ہے! سستی اور بے دلی پرانی باتیں ہیں، آج ہماری نظر دور تک دیکھتی ہے، ہم مستقبل کا پیغام سن رہے ہیں! آج ہمارے بولوں میں جان ہے، ہمارے گیت ذکیات ہیں!

کامریڈ پرافدا، شاعر کی ان باتوں کو! دھوائی نہ سمجھو، حقیقی زندگی کی رپورٹ ہے! شاعر اپنی اشتراکیت کو گواہ کر کے کہتا ہے کہ اب ہمارا دھقان "میرا کھیت" نہیں کہتا اب تو ہر چیز "ہماری" ہو گئی ہے! اسی طرح جیسے ہوا "ہماری" ہے جس میں ہم سانس لیتے ہیں۔ آج مذہبی تہوار روزہ (عید) ہے۔ پرانے زمانے میں آج کے دن گھرا د رکھتے سونے ہو جاتے اور مسجدیں بھر جاتی تھیں۔ لیکن آج "روزہ" کا کسی کو خیال بھی نہیں ہے، اب ہمارے لوگ غلام مانی کی یاد بھی کرنا نہیں چاہتے۔

آج ہمارے اسکولوں اور یونیورسٹیوں میں "برگیڈ" اور "شاک درکس" کے لفظ بولے جاتے ہیں۔ بانو زندگی میں گھوڑے پر صرف اس دن سوار ہوئی جس دن شادی کے بعد گے سے رخصت ہوئی تھی۔ آج کی بانو روزمرہ بس پر سوار ہو کر اسکول جاتی ہے۔

کامریڈ، آپ ہمارے کسی آدمی سے بھی پوچھئے کہ تمہارا ایڈر کون ہے؟ تو دیوار پر ٹنگی ہوئی ایک تصویر کی طرف انگلی اٹھا دے گا۔ اس کی تصویر کی طرف جس سے ہمیں محبت ہے اور ہم جس کا احترام کرتے ہیں۔

علی قریم بابائیت، کریمز شاعر کسی مستی کے عالم میں وطنی ترانہ الپتا ہے:-

"منحوس دشمن پر ہماری فتح و ظفر کا طوفان بھٹ پڑا ہے! میں اُس لمحے کی عزت کرتا ہوں! اس طوفان نے ہماری بیڑیاں کلاں دین غلاموں کو آزاد کیا کہ وہ جنگی علم بلند کریں! میں اُس پر عظمت دن کا خیر مقدم کرتا ہوں۔۔۔ ادیل اکتوبر کے دن کا!

سرزمین وطن میں دن رات تیری حفاظت کرنے کا عہد کرتا ہوں!"

ادین صابر وفا، ازبک شاعر، وطن کی سب سے بیش قیمت پیداوار، کپاس کا قصیدہ پڑھتی ہے:-

"آزاد دھقان! تمہارا دل نہیں دھڑکتا کہ اب تمہاری دادیاں اور کھیتیاں سرسبز شاداب ہوں گی؟ ایک دلپذیر خواب کے پروں پر اڑنا نہیں، اب تم موسم بہار کے سینے پر مشقت کیا کر دے! اب ہل اور پھاڑ سے نہیں، اب تمہاری ذراعت بڑی بڑی مشینیں کریں گی! دھقانو! آج تم مسرت کے آقا ہو اور تمہارا عزم دارادہ دنیا کی صورت بدل دے گا! ٹرکیر تمہارا دوست ہے اور تم خود اپنے آقا! آراخی مطلقاً تمہاری اپنی ہے! اب تمہارے چاروں طرف خوشیاں ہی خوشیاں ہیں!"

علی بے، ترکمان شاعر جب سرزمین وطن پر نہیں جاری دیکھتا ہے تو خرد مسرت سے چیخ اٹھتا ہے:-

"کون لایا، ہمارے ریگستان میں یہ مسرور اور گاتی مونی نہیں کوئی لایا؟ — پیانچ (دبی) کے طوفانی دھارے کو کس نے سدھایا؟ — ہمارے مفلوک اور دکھی دھقانوں کے لئے یہ راحت و مسرت کون لایا؟ — اتر کے رہنے والے لائے! شانوں سے بھری آزادی دلانے والے لائے! — مارکس اور لینن والے — بولشویک لائے!"

ایک نامعلوم تاجیک شاعر نے اور پرانے، سامنت شاہی اور سماج داد — یورپ و ایشیا کا معرکہ اس طرح نقش کرتا ہے:-

”میں نہ مٹنا چاہتا ہوں نہ بے (زمیندار) اور تاجر، میں نہ احمق اور اندھا درویش بننا چاہتا ہوں نہ ریشم میں ملبوس تاجر زادہ! میں اپنے چہرے، ہر رنگ و روغن چڑھانا نہیں چاہتا، میں نہ ناؤ کا مالک بننا چاہتا ہوں نہ امیر و تحصیلدار! میں نہ بوڑھے بوڑھیوں، طبیب بننا چاہتا ہوں نہ بازار میں ایک دوکان کا مالک، میں نہ تو ڈاکٹر بنوں گا یا لائبریرین اور یا پھر! جس وہ بننا چاہتا ہوں جو قین کے انگوٹوں میں لوگوں کے ذہن و خیال کے اندر تخم ریزی کو سکے جس طرح دھقان زمین میں ناج بوتا ہے! میں عوام کا کیسا بننا چاہتا ہوں!“

ایک تاجیک لوگ گیت میں شاعر قومی کردار کو اس طرح بیان کرتا ہے:-

”ہم تاجیک جو کچھ دیکھتے ہیں اسی کا گیت گاتے ہیں — ہمارے سامنے گھوڑا آتا ہے تو اس کا گیت بناتے ہیں — اور ہمارے گیت شیریں کلام شاعروں کے بنائے ہوئے ہیں — ایک گیت جو زمانہ کی چادر کی کوٹ پر چلتے اور رکتے ہیں! — پرانے شاعر شوانی حسن و جمال اور گل و بلبل کے گیت گاتے تھے — ہمارے آج کے شاعر نئی زندگی اور آزادی کے زمانے گاتے ہیں! — حسین مستقبل کا، مشین اور ہوائی جہاز کے گیت! — اور وہ سب سے زیادہ لیکن کا گیت گاتے ہیں، کہ لیکن نہ ہوتا تو کوئی گیت گایا ہی نہ جاتا! — وہی نانوں اور امیروں کے قصیدے بگے جاتے! — ہمارے شاعروں کو لیکن نے بحق دیا کہ وہ جس کا چاہیں گیت گائیں! اور وہ سب لیکن کا گیت گانے لگے!“

سہیلی بھی ایک تاجیک شاعر ہے اور حیات نو کا قصیدہ خواں! کہتا ہے:-

”تم ایک شہر دیکھو گے، نوشہ کے لباس کی طرح جگمگاتا ہوا شہر! — اور کتھنائی کا شاہانہ بھی سنو گے!

سنو! ہوائی جہاز کا پٹکا گھنگھار رہا ہے! وہ دیکھو، موٹر کس زناٹے کے ساتھ جا رہی ہے! یہ ہر سو، گرد اور دھو میں کے بادل اڑتی رہی

خراٹے بھرتی جا رہی ہے!“

اسی نظم میں آگے چل کر سہیلی بجلی کی روشنی اور ٹریکٹری غزل خوانی کرتا ہے:-

”دن ڈھلتے سنو کہ دھقان کی جھونپڑی سے کس گیت کی آواز آ رہی ہے، وہ گار رہا ہے:- وہ دیکھو، آسمان پر آزادی کا سورج چمک رہا ہے!

نہروں کا آزاد پانی ہماری وادی میں سرسبز! ترانہ گنگنا رہا ہے! سوویٹ شہری گاتے پھر رہے ہیں — ہر طرف گاتے پھر رہے ہیں!“

اور آگے چل کر سہیلی سوال کرتا ہے:-

”سُن رہے ہوں، آزاد تاجکستان کی ہر سرت آواز؟ — تاجکستان! تیری شان و عظمت کا، تیری خوشیوں کا زمانہ آگیا! — ہاں، میرے

کہستانی تاجکستان، تیری سرتوں کی ساعت آگئی!“

بروی قد بابا بیغ، ترکمان شاعر، انقلاب کی سترھویں سالگرہ پر اپنے دوستوں کو مبارکباد دیتا ہے:-

”آج میں شگیتی کلیوں کھلتے پھولوں کا گیت گاتا ہوں، کہ پرانی دنیا دفن ہو چکی ہے!

میرے ہاتھ میں یہ سرخ گلاب نہیں، نومولود بچے ہیں!

ہم نے اپنے وطن کی زمین کو خانوں اور امیروں کا خون پلایا ہے، اور اس خشک سالی کے بعد جو آج دفن ہے، یہ تازہ گلاب پھولے ہیں!

آسمان پر سورج بھی نیا نکلا ہے، نئی زندگی کا۔ دسج! جو سب سے زیادہ خوبصورت ہے! — ایک دو... دس گیارہ... سو سترہ!

ایک کے بعد دوسرا گزرتے ہوئے پورے سترہ سال گزر گئے! اور جہد و کوشش کا دھارا تیز تر ہوتا گیا، یہاں تک کہ میرے محبوب وطن ترکمانیہ۔

سوویٹ ترکمانیہ، میں زندگی سرت کا پھول بن کر کھلتے لگی!

اے! وطن عزیز، زندگی کے اس شگفتہ پھول کو لے! اور اس کی خوشبو سے ہر دن کو اشتراکیت کا معطر دن بنائے!“

لطیف الدین احمد

ادب لکاتبی الشاعر

(افادات علی حیدر طباطبائی نظم مرحوم)

ادنی تغیر کے ساتھ

شاعر و ادیب کو دہلی اور لکھنؤ کے اختلافات سے بھی مطلع ہونا چاہئے تاکہ جو جس زبان کا تتبع کرتا ہو اس سے غلط نہ ہو جائے۔ ان دونوں شہروں کے بچے میں تو بڑا اختلاف ہو گیا ہے لیکن الفاظ و محاورات میں زیادہ اختلاف نہیں ہے۔ جن باتوں میں اختلاف ہے اس کا استنباط کسی نے نہیں کیا۔ مجھے جو الفاظ معلوم ہیں لکھتا ہوں۔ اکثر یہ اختلاف مرزا داغ مرحوم اور اہل دہلی کے بعض دوسرے احباب سے معلوم ہوئے مثلاً ایک دفعہ انھوں نے کہا کہ لکھنؤ میں ہمارے یہاں بولتے ہیں دلی میں ہمارے ہاں کہتے ہیں اور یہی صحیح ہے، یہ سن کر میں نے اس بات کا تفحص کیا تو معلوم ہوا کہ دہلی میں بھی محاورہ ہمارے یہاں اور ہمارے ہاں دونوں میں۔ میر کا دیوان جو کلکتہ میں چھپا ہے اور قرون کا چھپا ہوا ہے اس میں جا بجا ہمارے ہاں اور ان کے ہاں موجود ہے، میں نے میر تقی میر مرحوم سے پوچھا تو انھوں نے کہا ہم تو جب کہیں گے ہمارے یہاں کہیں گے۔ سب کہتے ہیں:-

”لیلۃ القدر ہے بندہ کے یہاں آج کی رات“

اسی طرح مرزا داغ مرحوم ایک دفعہ کہنے لگے کہ زیور گھر ٹانا دہلی کا محاورہ ہے، اہل لکھنؤ نے اس میں تصرف کر دیا اور گردھنا کہنے لگے، لیکن نفس سے معلوم ہوا کہ اصل لفظ گردھنا ہی ہے اور پہلے دہلی کا محاورہ ہی تھا۔ قدرت اللہ شوق سنبھلی نے ۱۹۱۷ء میں طبقات الشعراء تصنیف کی ہے۔ تصنیف کے بائیس برس بعد کا لکھا ہوا نسخہ یعنی ۱۹۳۷ء کا موجود ہے، ظاہر ہے کہ یہ نسخہ سو برس سے زیادہ کا لکھا ہوا ہے اس میں امیر خسرو دہلوی کے دو شعر درج ہیں اور دونوں شعروں میں گردھنے کا لفظ آیا ہے:-

زرگر پسرے چو ماہ پارا ، کچھ گردھنے سنوارے پکارا ،

نقدِ دل من گرفت و بشکست ، آخر نہ گردھنا نہ کچھ سنوارا ،

انیس مرحوم سے میں نے ایک دفعہ ذکر کیا کہ میر محمد حسین آزاد، مالا کی جمع مالائیں کہتے ہیں، انھوں نے کہا کہ مالا، دلی کی زبان پر مونس ہے لیکن میر حسن کی شنوی میں یہ شعر موجود ہے:-

وہ موتی کے مالے لٹتے ہوئے ، رہیں دل جہاں سر ٹپکتے ہوئے

میں نے یہ شعر انھیں سنایا اور انھوں نے بہت تعجب کیا۔ ایک دفعہ ان مرحوم سے میں نے پوچھا کہ لکھنؤ کی زبان کے کچھ الفاظ ایسے بتائیے جو دلی میں نہ پوئے جاتے ہوں اور اہل دہلی ان لفظوں کو مکروہ سمجھتے ہوں، کچھ سوچ کر کہنے لگے کہ یہ محاورہ لکھنؤ کا کہ ”یہ کام مجھے کھلتا ہے“۔ مجھے بھی اچھا نہیں معلوم ہوتا ہے جن اتفاق سے مولوی نذیر احمد صاحب کی کتاب ابن الوقت ایک صاحب دیکھتے تھے وہ میر سے پاس لے آئے اور پوچھنے لگے کہ اکھڑا کیا لفظ ہے اور اس کے کیا معنی ہیں، اسے دیکھ کر مجھے معلوم ہوا کہ کھیلنے کی جگہ پر دلی میں اکھڑا کہتے ہیں۔

ایک نقل اور مجھے یاد آئی انھیں مرحوم کی فرمائش سے میں کچھ شعر پڑھ رہا تھا بصورت بے تکلف تھی میں نے پڑھا:-

لگا دے تیرے پر مجھ کو بقیراری دل ، کو منہ کے سہل میں گرول جا کے اپنی منزلی پر

کہنے لگے دلی میں منہ کے بل کہیں گے میں نے کہا کہ لکھنؤ میں تو سب منہ کے بھل کہتے ہیں اس پر انھوں نے کہا کہ میرا گمان ہے کہ میر تقی میر نے کہیں نہ کہا ہوگا۔

میر انیس کی رباعی کا یہ مصرع میں نے پڑھا ۶ ”گر پاؤں تھکے تو سر کے بھل جاؤں گا“

مرزا داغ مرحوم تذکرہ آب حیات کو کچھ اچھی نظر سے نہ دیکھتے تھے۔ مصنف نے بھی تو بڑی نا انصافی کی کہ ذوق کے ضمن میں بھی داغ کا ذکر نہیں کیا آزاد کے اس فقرہ پر نکتہ چینی ہو رہی تھی کہ اہل لکھنؤ کھانے کا ہو تو تبا کو کہتے ہیں اور پینے کا ہو تو تبا کو بولتے ہیں۔ میں نے کہا صاحب وہ تو بڑے محقق معلوم ہوتے ہیں وہ تو اندھیاری رات کا بھی انکار کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ دلی کی زبان میں گورے ہی کو اندھیاری کو اندھیاری کہتے ہیں۔ اندھیاری رات کہنا خلات محاورہ اردو ہے مرزا داغ مرحوم نے کہا یہ تو ٹھیک لکھا ہے۔ میں اسی زمانہ میں سودا کا دیوان پڑھ رہا تھا، کو تو ال کی بچو تک جب مقام درس پہنچا تو یہ شعر دیکھنے میں آیا:-

ہوگی کب تک بچا خبر داری چور جاتے رہے کہ اندھیاری

پھر ملاقات ہوئی تو یہ شعر میں نے انھیں سنایا اور یہ ثابت کر دیا کہ اندھیاری رات دلی کی زبان ہے۔ گو اب نہ بولتے ہوں یا لکھنؤ کے مقابلہ میں ترک کر دیا ہو۔

یادش بخیر آغا شاعر دہلوی بڑے خوش فکر و صاحب دیوان مرزا داغ مرحوم کے افسح تلامذہ میں ہیں۔ ایک دفعہ مجھے راہ میں ٹھہرا کر کہنے لگے کہ یہ مصرع کیسا ہے:- ”مونٹ سل جاتے ہیں جب سامنے تو ہوتا ہے“۔ میں نے کہا ہم تو یوں کہیں گے:- ”مونٹ سی جاتے ہیں جب سامنے تو ہوتا ہے“ یہ سنکر کچھ افسردہ ہو کر کہنے لگے کہ استاد نے بھی یہی بنا دیا ہے۔ میں نے کہا آپ نے ان سے کیوں نہ کہا کہ سل جانا، دھس جانا دلی کا محاورہ ہے اور سی جانا، دھو جانا لکھنؤ کی زبان ہے، ہم کیوں لکھنؤ کی زبان کا متبع کریں۔ ہنس کر کہنے لگے میں نے یہی کہا تھا کہ استاد برہم ہو گئے اور فرمایا کہ تم نے بھی استاد ذوق سے ایک دفعہ ایسی ہی بحث کی تھی تو انھوں نے ایک تھپڑ مارا، جو لوگ تحقیق زبان اردو کا شوق رکھتے ہیں ان کو استاد شاگرد کی یہ اصلاح و بحث نظر غور سے دیکھنا چاہئے۔

مرزا داغ مرحوم کہتے تھے کہ جب سے میں نے ہوش سنبھالا سانس اور فکر کا لفظ ذکر ہی بولتے سنا مگر استاد ذوق نے جب سانس کو نظم کیا مونٹ نظم کیا بلکہ بادشاہ کی غزلوں میں بھی اسے مونٹ کر دیا اور فرماتے تھے کہ میر کی زبان پر بھی یہ لفظ مونٹ ہی تھا اور مرزا غالب نے مجھے یہ ہایت کی ہے کہ فکر کو بھی مونٹ ہی نظم کیا کرو۔

فون غنہ زیادہ کرتے ہیں۔ بیسے کو پتل۔ جھونٹ۔ سینکڑوں۔ تھوٹلا (یعنی درخت کا تنہالا) موتی۔ بندھنا وغیرہ۔ مگر لکھنؤ کے لہجے میں ان الفاظ میں ذوق غنہ۔ لفظوں میں ٹ بولتے ہیں مثلاً بوجھاڑ آئی، کڑوڑوں بوندیاں ٹرگئیں میں نے میر مہدی بخرواح مرحوم کے کلام میں کو اڑ کا قافیہ بوجھاڑ دیکھا ہے۔ دلی میں جھڑنٹ کا قافیہ کروٹ لاتے ہیں۔ لکھنؤ میں جھڑنٹ کا لفظ بضم میم بولتے ہیں۔ انیس کو وہ لوگ بہ تشدید تاء اور لکھنؤ میں بہ تخفیف تاء بولتے ہیں۔ گھینچنا وہ لوگ یسے مجھول کے ساتھ بولتے ہیں اور لکھنؤ میں بفتح کاں۔ کچھ الفاظ دلی کی زبان کے ایسے بھی ہیں کہ لکھنؤ میں بولے نہیں جاتے مثلاً گھنڈی بھرت ہو گیا۔ پا کھنڈ کرتا ہے۔ کڑی جالاپورتی ہے۔ اور ٹوپی اور ہٹنا۔ اسی طرح ہتھیار بچنے کو ہتھیار بچانا۔ ٹھیک نکل جانا۔ پترے کھولنا۔ رونکے ہو جانا۔ بدکنا۔ اوڑسنا۔ چھپنے سے چھپوں اور دکنے سے دکنوں اور ہولے ہولے یعنی آہستہ آہستہ لکھنؤ میں کوئی نہیں بولتا۔ بخرواح کہتے ہیں:- رشک اعدا کا گھن مرے دل کو ہولے ہی ہولے کھائے جاتا ہے

مرزا قار بخش صاحب شاہزادہ دہلوی کے کلام میں بل جانا، صدقے ہو جانے کے معنی پر میں نے دیکھا۔ شہزائے دہلی تیوری اور ڈیوڑھی وغیرہ میں سی کو وزن میں داخل کرتے ہیں اور اہل لکھنؤ کے لہجے میں سی کو معدول سمجھتے ہیں۔ بخرواح دہلوی نے پیاسے کی آبی کو بھی وزن شعر میں داخل کر لیا ہے۔ یہاں ہیں آب خنجر کے پیاسے بجھے کیا تشنگی آب بقاسے

یہ سب تو لفظی اختلافات تھے ایک بڑا نحوی اختلاف بھی دونوں زبانوں میں ہے یعنی حرف نے کو دہلی میں حرف اصناف کے معنی میں بولتے ہیں جس زمانہ میں دیوان غالب کا شرح میں لکھ رہا تھا اس بات پر جی بھی مجھے متنبہ ہوا لیکن میں سمجھا کہ اس طرح کانے حال میں پیدا ہو گیا ہے اور اہل پنجاب

کی صحبت کا اثر ہے مگر ابو ظفر بادشاہ طاب ثراہ کے دیوان میں، جابجا یہی (نے) دیکھنے میں آیا اور اس سے پتہ لگا کہ مدت سے یہ خرابی پیدا ہوئی ہے۔ یہ پنجاب کا محاورہ بادشاہ کی زبان پر بھی چڑھا ہوا تھا۔

ہم نے ہے خوب اس کی طرز نماز پچانی ہوئی چال پچانی ہوئی آواز پچانی ہوئی
لیکے دل کو جان تو چھوڑے اگر امکان کیا خوب ہی ہم نے تجھے ہے دستاں دیکھا ہوا

مگر دہلی کو اس امر سے سبق لینا چاہئے کہ وہاں کے تمام شعرا لکھنؤ - ذوق - مومن - غالب نے کیوں اس محاورے سے احتراز کیا اور ان کے بعد اصغر علی خاں نسیم، مرزا قادر بخش صاحبزادہ، میر محمدی مجروح - نواب مرزا داغ نے کہیں بھی اس طرح سے نہ استعمال نہیں کیا۔ سالک دہلوی، مرزا نوشہ کے ممتاز شاگردوں میں تھے۔ حیدر آباد میں مرحوم ہو گئے۔ اکثر ان کا کلام میں نے سنا ہے۔ مجھے یاد نہیں پڑا کہ اس طرح (نے) استعمال انہوں نے کیا ہو۔ یہ تو سب لوگ اہل فن اور اہل زبان ہیں۔ ان لوگوں کا اس لفظ کو استعمال نہ کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ یہ محاورہ پنجاب کا ہے۔ اس کے علاوہ حضرت ظفر کی ایک غزل کا ردیف وقافیہ ہے۔ کہا جنھوٹے موٹ - وفا جنھوٹے موٹ یہ دہلی کا خاص محاورہ ہے اور لکھنؤ میں جنھوٹے موٹ کہتے ہیں۔ پیر کا مخفون لکھنؤ میں پتہ ہے۔ دہلی کے لہجہ میں پتہ ہے۔ خواجہ وزیر لکھنوی کہتے ہیں: "لوٹا ہے دن دھاڑے، یہ انھیں ہو گبات دہلی میں دن دے کہیں گے۔ لکھنؤ کا زردہ، میٹھے چانول اور دہلی کا زردہ کھانے کا تنباکو۔ لکھنؤ میں کہیں گے زمین گھومتی ہے لیکن دہلی میں گھومتی ہے لفظ ہی نہیں بولتے۔ چند الفاظ اختلافات دہلی و لکھنؤ کے متعلق اور یاد آگئے مثلاً اہل لکھنؤ بڑی کو رابڑی - کن پیر کو کرمل - سداؤنی کو سانی لاکھنے کو ناگھنا - ناک سنکے کو ناگ چنکنا - جولاہی کو جولاہن - سناری کو سارن کہتے ہیں اور یہ بیان ان کا بہت درست ہے۔ لیکن ایک رسالہ میں یہ بھی لکھا ہے کہ اہل لکھنؤ انگلیٹھی کو برسی - دھوبی کو بریٹھا - چھوکرے کو بروا - بگوٹے کو بونڈلا - تمباکو کو بھسا کو - بگھارنے کو دھنگارنا - کہاری کو کہارن - لنگوٹیا یا ر کو لنگوٹیل یار - بانس کو پٹیر کہتے ہیں یہ بالکل غلط ہے۔ لکھنؤ کی زبان کے یہ الفاظ نہیں ہیں۔ بیگن کے بھرتے کو دھنگانا یعنی دھوئیں کی بو اس میں پیدا کرنا۔ لیکن بگولا یا بھولا اور چیز ہے۔

ہی کا استعمال اہل دہلی اس طرح بھی کرتے ہیں کہ حروف معنویہ کے بعد اے آتے ہیں۔ مثلاً ہم نے ہی لکھا - تم نے ہی پڑھا - اسنے ہی سنا۔ اہل لکھنؤ ہمیشہ ہی کو مقدم کر کے کہتے ہیں۔ جیسے ہمیں نے لکھا - تمھیں نے سنا - اسی نے پڑھا یا مثلاً وہ کہیں گے دلی کی دلی میں ہی رہی - اور کہیں گے دلی کی دلی ہی میں رہی - مومن خاں صاحب کہتے ہیں

کچ دار و مرز کب تلک یوں ساقی مجھے دے شراب گلگوں

لکھنؤ میں یوں، دوں، کیوں، جوں یہ سب الفاظ بواؤ مجہول بولے جاتے ہیں۔ دہلی میں میں اپنے آپ کو بولتے ہیں۔ لکھنؤ میں اپنے آپ کو یا اپنے تمیں کہیں گے۔ پیر نے اور تیر نے بھی کسی قدر اختلاف ہے تذکر و تائیت کے زمانے جو لوگوں نے لکھے ہیں اس کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ صد ہا لفظوں میں دہلی و لکھنؤ کے محاورے میں اختلاف ہے مگر ایسا نہیں ہے اختلاف محاورہ اس لفظ میں مسلم ہے جو لفظ محاورہ عام میں داخل ہو۔ جیسے سانس اور فکر کی تذکر و تائیت میں دونوں شہروں میں اختلاف ہے جو لفظ محاورہ خاص میں داخل ہو۔ جیسے عارض و گیسو کی تذکر اور شمشیر و سنان کی تائیت شعرا کے محاورہ میں داخل ہو گئی ہے ایسے الفاظ میں بھی اگر دہلی و لکھنؤ میں اختلاف ہو تو البتہ اسے بھی اختلاف کہیں گے وجہ اس کی یہ ہے کہ کو اس قسم کے الفاظ محاورہ عام میں داخل نہیں ہیں۔ اہل شہر ان الفاظ کو بولتے نہیں ہیں۔ لیکن سمجھتے تو ہیں۔ اس کے سوا جتنے الفاظ ہوں ان میں دہلی و لکھنؤ کا اختلاف قابل اعتبار نہیں ہے اسے اختلاف محاورہ کہہ سکتے ہیں۔ بہلا نا مانوس وغیرہ مشہور الفاظ میں محاورہ کو

اے ہم لوگ اوکڑو میٹھا، وہ اوکڑوں میٹھا بنون غنہ بولتے ہیں۔ ہم پینگ لینا بیاسے مجہول بولتے ہیں وہ لوگ پینگ یا سے معروف کے ساتھ کہتے ہیں، ہم ترنگ کہتے ہیں وہ ترنگ بولتے ہیں۔

کیا دخل ہے جو جس طرح چاہتا ہے استعمال کر لیتا ہے۔ ایسے الفاظ میں کسی کو دہلی و لکھنؤ کی تقلید کرنا کچھ ضرور نہیں۔ اہل لکھنؤ اور اہل دہلی خود ایک دوسرے کے ساتھ لفظوں میں اختلاف عظیم رکھتے ہیں اور یہ اختلاف آٹھ تو بکھڑا کر آٹھ - دہار محاورہ پر ہے۔

لفظ طرز، لکھنؤ دہلی میں کسی زمانہ میں مونث تھا اور اب بعض شعرا جو اپنے اسانزہ کی تقلید کو محاورہ حال پر مقدم سمجھتے ہیں وہ مونث نظم کے جاتے ہیں ورنہ دونوں جگہ کے محاورے میں مذکر ہے۔ میں نے اکثر اہل دہلی کی تقریر و تحریر میں مثل سر سید احمد خاں مرحوم کے اس لفظ کو تذکرہ دیکھا۔ بلکہ اگلے زمانہ میں بھی یہ لفظ دہلی میں تذکرہ مستعمل ہوا ہے۔ شاہ عالم بادشاہ آفتاب دہلی کا یہ سطاح صغیر بلگرامی نے رشحات میں لکھا ہے :-

جب سامنے مرے وہ پریرا آگیا ، دیوانگی کا طرز مجھے یاد آگیا ۔

لفظ مخلوق لوگوں میں اسم مونث مشہور ہو گیا ہے لیکن لکھنؤ کے محاورہ میں یہ لفظ سبک صفت رکھتا ہے۔ کہتے ہیں آسمان خدا کا مخلوق ہے اور زمین خدا کی مخلوق ہے۔ لفظ نظیر کو لوگ عموماً مونث بولتے ہیں لیکن اہل لکھنؤ ذوی العقول کے مقابل میں مذکر بولتے ہیں۔ کہتے ہیں اس عورت کا نظیر نہیں میرے شفیق مکریم حکیم میرضامن علی مرحوم جلال نے مجھ سے کچھ اشعار پڑھنے کی فرمائش کی۔ اس زمانہ میں منجھلے حضور مرشد زادہ مرشد آباد مشاعرے کیا کرتے تھے۔ انھیں کی طرح میں کچھ شعریں نے بھی کہہ کر بھیج دی تھیں۔ وہی اشعار مجھے یاد آگئے۔ پڑھنے لگا۔ اور باصرار میں نے کہا کہ اگر کوئی شعر ٹوکنے کے قابل ہو تو ضرور کہہ دیجئے گا۔ میں ان لوگوں میں نہیں ہوں جو اعتراض سے ہرمان جانتے ہیں۔ چنانچہ میرے اس شعر پر :

سر جو ٹکرایا تو دیواروں کو رنگیں کر دیا ، ایڑیاں رگڑیں تو صیقل ہو گئی زنجیر میں

جناب جلال صاحب نے کہا کہ صیقل مذکر ہے اور یہ فرمانا ان کا بعض اسانزہ کی تقلید کے لحاظ سے تھا ورنہ لفظ صیقل دہلی و لکھنؤ میں اب مونث بولا جاتا ہے۔

تذکرہ تانیث الفاظ سے بحث کرنا اہل لغت کا کام ہے۔ لیکن میں اس مسئلہ میں بعض امور کا ذکر کر دینا مناسب سمجھتا ہوں۔ ایک تو یہ کہ صفت تذکرہ تانیث میں موصوف کے تابع ہوا کرتی ہے۔ دوسرے یہ کہ تمیز و ظروف و بعض متعلقات فعل تذکرہ تانیث سے معتر ہوتے ہیں۔ مثلاً "تو نے اچھا کام کیا" اس جملہ میں اچھا صفت ہے اور کام موصوف۔ کام کے مذکر ہونے کی وجہ سے اچھا بھی اس مقام پر مذکر ہے۔ اگر یہ کہیں کہ "تو نے اچھا کیا" تو اچھا مذکر ہے نہ مونث ہے۔ اس سبب سے کہ اچھا اب صفت نہیں ہے، مثل اس کے کہ "تو نے جو ٹکھ کہا" میں سچ بولا۔ وہ خوب پڑھا۔ ان جملوں سے جو ٹکھ سچ وغیرہ کا مذکر ہونا ثابت نہیں ہو سکتا۔ اگر یوں کہیں کہ سب جو ٹکھ سچ کھل گیا تو اس سے جو ٹکھ سچ کا ذکر ہونا ثابت ہو تا ہی اسلئے کہ یہاں تمیز فعل نہیں۔ بلکہ فاعل ہے۔ مثل اسی کے ہے، اگر یہ کہیں کہ زید ایک دن آیا، اس جملہ میں دن تذکرہ تانیث سے معتر ہے۔ اس سبب سے کہ ظرف فعل ہے تیسرے یہ کہ اردو میں بعض اسماء جزو فعل ہو جاتے ہیں اور اس صورت میں ان اسماء کو تذکرہ تانیث سے کچھ تعلق نہیں رہتا مثلاً میں نے سبق یاد کیا۔ اس مثال میں یاد کا لفظ تذکرہ تانیث معتر ہے۔ اردو کی نحو میں یہ بحث اہم مسائل سے ہے۔ گلگرسٹ کے سوا کسی نے ادھر توجہ نہیں کی۔ چوتھے یہ کہ افعال ناقصہ کی خبر اور افعال مقلوب کا دوسرا مفعول یہ دونوں تذکرہ تانیث سے معتر ہوتے ہیں۔ مثلاً اشک گوہر ہو گیا۔ اشک گوہر کر دیا۔ اشک گوہر سمجھنا۔ ان فقروں سے گوہر کی تذکرہ تانیث نہیں ثابت ہو سکتی۔ پانچویں یہ کہ مضاف الیہ کے بعد اگر مضاف ہو تو حرف معنویہ کے الحاق سے مضاف کی تانیث میں کچھ تغیر نہیں ہوتا یعنی (کی) جو علامت تانیث مضاف ہے اس کا باقی رکھنا ضرور ہے۔ مثلاً :-

نور نظر کی آنکھوں میں سرمہ دیا۔ لیکن اگر ترکیب اضافی مقلوب ہو جائے۔ جیسے میر انیس کے اس مصرعے میں ہے :-

"سرمہ دیا آنکھوں میں کبھی نور نظر کے۔ اس صورت میں (کی) کی جگہ کے کہنا بھی درست ہے۔ دلیل اس کی یہ ہے کہ اس مصرعہ میں سے اگر (آنکھوں میں) حذف کر دیں تو یہ فقرہ باقی رہ جائے گا (سرمہ دیا کبھی نور نظر کے) اور اب (کے) کہنا واجب ہو جائے گا۔ جیسے لوگ کہتے ہیں اس کے ٹکسی کی اور مقصود یہ ہوتا ہے کہ سرمہ یا بالوں میں اسی طرح کہتے ہیں اس کے گدگدی کی یا اس کے چنگی لی اور یہ مقصود ہوتا ہے کہ بغل میں

یا گردن میں۔ غرض کہ ضابطہ یہ ہے کہ ترکیب اضافی اپنی اصل پر ہو تو علامت تانیث مضاف یعنی کی کہنا واجب ہے اور حذف و تقدیر مضاف کی صورت میں (کے) کہنا واجب ہے۔ اور قلب ترکیب کی حالت میں دونوں طرح جائز ہے۔ انیس کے اس مصرع کو :-
میدان میں تھا حشر بپا چال سے اسکے

اور آتش کے اس شعر کو :-

معرفت میں اس خدائے پاک کے اڑتے ہیں ہوش دھواں ادراک کے

صغیر بلگرامی نے اس بات کی سند میں لکھا ہے کہ چال اور معرفت مذکور ہے۔ میں اس رائے سے اتفاق نہیں کرتا۔ میری رائے میں ان مصرعوں میں کی اور کے دونوں کہہ سکتے ہیں۔ شاعر نے ضرورت شعر کے سبب سے کے اختیار کیا اور اسی قیاس پر برق کا یہ مصرع :-

”داڑھی میں لال بال تھے اس بدنہاد کے“ اور ”میر کا یہ مصرعہ“ ”آنکھوں میں ہیں حقیر جس تش کے“۔ غلط نہیں ہو سکتا۔ کلکتہ میں ایک صاحب کی غزل میرے پاس اصلاح کو آئی اس میں یہ مصرعہ تھا اور یہی زمین تھی :- ”بھینکی کند آہ طرف آسمان کے“۔ میں نے دیکھا کہ یہاں کی کہیں تو محاورہ کا خون ہوتا ہے یہ نہیں رہنے دیا۔ اب چاہے کوئی غلط سمجھے لیکن لفظ طرف میں محاورہ یہی ہے کہ اصل ترکیب باقی ہو تو کی کہیں کے اور قلب ترکیب کی صورت میں کے کہتے ہیں۔ بہار عشق :- ”جان پر بن رہی ہمارے ہے“۔ مر رہا تو جگت کے مارے ہے۔

بلا ضرورت ہر زبان کا لفظ لینا بھی نہیں درست البتہ فارسی کا میل اردو میں حسن رکھتا ہے۔ یہاں تک کہ جو الفاظ عربیہ فارسی میں غلط ہو کر مخلوط ہو گئے ہیں ان کی تصحیح کرنا بھی نہ چاہئے اور بلا واسطہ الفاظ عربیہ کا لینا تو بہت ثقیل ہے۔ لیکن فارسی زبان کے اسما و صفات ہی اردو میں کچھ اچھے معلوم ہوتے ہیں مصادر و روابط سے نفسی کراہیت کرتے ہیں۔ یہ نہ چاہئے کہ درعین انتظار آپ کا خط پہنچا اور خیریت آپ کی درگاہ خدا سے نیک درکار ہے۔ بہت سے الفاظ جو ہنزلہ روابط کلام ہیں۔ فارسی خوانوں کی زبان پر چڑھ گئے ہیں۔ اور بعض عربی کے الفاظ بھی اسی قسم کے اہل کتب نے فارسی پڑھنے کی بدولت زبان میں داخل کر لئے ہیں۔ وہ سب کے سب کسی قدر فصاحت سے گرسے تو ہوتے ہیں مثلاً چونکہ از بسکہ بد رستی کہ تحقیق کہ حال آنکہ باوجودیکہ باوصفیکہ چنانچہ جزیں نیست ہر آئینہ ماقبل مابعد پیش ازیں علاوہ بریں در پیش کار در اصل در حقیقت بر خلاف برعکس، بر محل بہ نسبت بموجب بدولت ہنوز نہیں۔ لہذا لابد لاریب فی الحال بالفعل بالکل فہما حتی الوسع حتی المقدور بالمشافہہ بالموجہ فقط یعنی وغیرہ۔ جس زمانے میں میر انیس مرحوم حیدر آباد میں تھے۔ انھیں دنوں کا ذکر ہے کہ ایک صاحب ان کے کلام کو کلام میر پر ترجیح دینے لگے، میر صاحب نے فرمایا کہ میر استاد کامل تھے۔ انھوں نے جواب دیا کہ آپ کے اور ان کے کلام کا میں نے مقابلہ کر کے دیکھا آپ ہی کا کلام تفوق رکھتا ہے میر صاحب کو تعجب ہوا کہ مرثیہ اور غزل کا کس طرح مقابلہ ہو سکتا ہے یہ اور راہ ہے وہ اور کو چہ ہے۔ ان بزرگ نے میر کا ایک مطلع پڑھا :-

اس زلف پہ محو ہو گئے ہم
یعنی سر شام سو گئے ہم
اور کہا کہ اس مطلع میں اس زلف اور یعنی کو ملاحظہ کیجئے اور اسی زمین میں آپ کا مطلع بھی مجھے یاد ہے اس کی صفائی کو دیکھئے :-
ایک آہ میں سر دھو گئے ہم
تھنڈی جو ہوا تھی سو گئے ہم

یہ سن کر میر انیس مسکرائے لگے۔

فارسی و عربی کے بعض الفاظ اردو میں غلط بولے جاتے ہیں۔ اور غلط ہی بولنا چاہئے بھی۔ ان کا صحیح کر کے بولنا ہندیوں کی زبان پر ثقیل ہے۔ جیسے عیادت و عیال و عیاں بکسر عین ہے۔ مگر بولتے بفتح ہیں۔ ایک نقل میں نے سنی ہے کہ میر حکیم ضامن علی مرحوم جلال سے نواب کلب علی خاں مرحوم والی رامپور نے پوچھا کہ آپ عیاں کو عیاں کہیں گے انھوں نے جواب دیا کہ عیاں تو ہم کبھی نہ کہیں گے۔ لفظ رفو میں ت کو ساکن پڑھنا چاہئے لیکن فارسی و ہندی کے لہجہ میں اس کا تلفظ مشکل تھا۔ رفو بضم فاستعمل ہو گیا۔ اسی طرح ناگوار و گوارا میں کان مضموم ہے لیکن اردو میں بفتح کان ہی مستعمل ہے، لفظ رعشہ اور لفظ عیار کو اکثر اہل لغت بکسر اول صحیح سمجھتے ہیں۔ لیکن اردو میں بفتح اول ہی بولنا چاہئے۔ لفظ مطاع بکسر لام اور لفظ مدقع بکسر قاف صحیح ہے لیکن اردو میں اس کی تصحیح مکن نہیں جمع سے التباس ہو جاتا ہے۔ عوض علی خاں، میر انیس کے ایک شاعر تھے

انہوں نے مجھ سے بیان کیا کہ میں نے عمو کو بواو معروف پڑھا تو میر صاحب نے منع کیا اور کہا عمو کہو بواو مجبول اور نور چشم کے لفظ میں کسرہ اضافی کے پڑھنے کو بھی میر صاحب منع کیا کرتے تھے۔ کہتے تھے یہ اضافت اردو میں بری معلوم ہوتی ہے۔

بعض الفاظ عربی الاصل اردو میں اس طرح مل گئے ہیں کہ ان کا بدل نہیں ہو سکتا اور پھر اصل معنی بھی ان میں باقی نہیں رہے، جیسے واسطے۔ طرح۔ معارف وغیرہ ممکن ہی نہیں کہ ان کی تصحیح کی جائے۔ البتہ یہ غلط سمجھا جائے گا کہ تقریباً کے محل پر تقریباً، اندازاً لکھا جائے یا حال کے محل پر لفظ موجودہ۔ ایسے محاورے غلط ہیں دوسرے یہ کہ بعض لوگوں کے نکالے ہوئے یہ الفاظ محاورہ عام نہیں ہیں بلکہ وہ محاورہ عوام میں۔ محاورہ عام کی تصحیح البتہ محل فصاحت ہے جیسے لا یعقل ولا ابالی بلا لحاظ ضمیر متکلم وغائب بولتے ہیں۔ اس طرح لفظ یعنی ہے کہ اس میں ضمیر غائب کا لحاظ مطلق میں کرتے۔

بعض الفاظ سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اصل ان کی کچھ اور تھی لیکن دہلی لکھنؤ کے لوگوں نے تصرف بجا کیا ہے مثلاً جھکولے کو جھکولا کہنا دونوں شہروں کا محاورہ ہے مگر میر خیال میں جھکولا ہی فصیح ہے اور قدیم اردو یہی ہے قدمائے شعرا کے کلام میں یہ لفظ موجود ہے۔ اسی طرح لفظ چیدہ میں تصرف کر کے دہلی، لکھنؤ کے لوگوں نے پھندہ کہنا شروع کیا۔ اور یہ بھی عامیانہ محاورہ ہے، جھلک میں اہل لکھنؤ نے تصرف کر کے جھلکی بنا دیا۔ شاہزادہ میرزا آسمان جاہ مرحوم کا ایک شعر مجھے یاد آیا ہے

سِرک جاتے ہیں اک جھلکی دکھا کر کہ رہ جائے پھڑک کر دل کسی کا
اور اہل دہلی نے تصرف کر کے جھلکا بنایا مرزا داغ مرحوم کہتے ہیں مصرعہ ”اپنے کوٹھے سے جو کل اس نے دکھایا جھلکا“۔ بعض الفاظ دہلی میں اپنے اصل پر ہیں اور اہل لکھنؤ نے تصرف کیا مثلاً دھکیلنا دال ایچہ سے دلی کی زبان ہے اور ڈھکیلنا دال ہندی سے لکھنؤ کا محاورہ ہے۔ اسی طرح کھردرا کو مخفف کر کے اہل لکھنؤ کھدرا کہتے ہیں مگر مجھے کھدرا ہی فصیح معلوم ہوتا ہے۔

بعض الفاظ اصل میں جمع ہیں اور محاورے میں مفرد بولے جاتے ہیں جیسے ارواح، اوقات، اولاد، بعض الفاظ مفرد ہیں اور محاورے میں جمع بولے جاتے ہیں مثلاً ”اس کے کیا معنی“ جو خالص زبانیں دنیا میں ہیں ان میں اہل دیہہ کا محاورہ مستند سمجھا جاتا ہے، کیونکہ اہل شہر کی زبان غیر قویوں کے غلط سے محفوظ نہیں رہتی۔ ابتدائے اسلام میں جب عربی کی زبان بگڑنے لگی تو اہل بادیه و اعراب سے زبان کو مطابقت دیا کرتے تھے لیکن اردو محاورہ زبان ہے۔ اس کا معاملہ برعکس ہے اہل شہر کی اردو گاؤں والوں سے اچھی سمجھی جائے گی، تعجب ہوتا ہے کہ لکھنؤ سے تھوڑی دور باہر جائے تو آنکھیں کھلنے کے بدلے آنکھیں بفتح کان اور کلا گھوٹنے کو گھوٹنا بواو مجبول اور جاگنے کو جگانا بولتے ہیں۔ یہی حال دہلی کے گاؤں والوں کا ہے۔ آئے کو آگیا۔ روٹی کو روٹی بتشدید پانی کو پانٹریں بولتے ہیں۔

تازگی لفظ کا ہر اہل قلم کو خیال ہوتا ہے اور بیشک لفظ تازہ مضمون تازہ کے برابر بلکہ بہتر ہے لفظ کے انتخاب کرنے کا امتیاز خدا داد بات ہے کوئی لفظ خوبصورت ہوتا ہے کوئی بھونڈا پھر صرف کرنے کا سلیقہ بھی فطری قابلیت ہے بعض الفاظ اصل میں اوجھا ہے لیکن کسی ایسے محل پر صرف ہوا کہ خوبصورت ہو گیا یہ نہ ہونا چاہئے کہ آپ نے لفظ کو تازہ سمجھ کر صرف کیا اور سننے والے کو وہ لفظ غریب و وحشی معلوم ہوا۔ میرافیس، شاہزادہ علی اکبر کی اذان کا ذکر فرماتے ہیں ۶ ”وہ لودھی کہ جس کی فصاحت دلوں کو بھائے“۔ اکثر لوگوں کی رائے ہے کہ یہاں لودھی کا لفظ غریب ہے اور سچیل بھی صرف ہوا ہے۔ شہسوی ششقیہ میں جہاں ملاؤں اور قاریوں پر آوازے کسے ہیں ایک شعر میں الفاظ غریب کو عمدائیں نے بھر دیا ہے آپ عریف میں غشتم ہیں آپ غطریف ہیں غططم ہیں

محل ابو میں ان الفاظ کا استعمال غالباً بجا تو نہیں ہوا۔ اس سبب سے کہ یہاں اس کی نقل کرنا منظور ہے میر علی اوسط مرحوم کہتے ہیں:-
”رنگ کو اقرار ہے رائے زرین یار کا!“ اس مصرع میں لفظ زرین تازہ نہیں ہے بلکہ غریب ہے اور پھر اپنے محل سے بھی الگ ہے اگر حضرت واعظ یا جناب شیخ یا ناصح مشفق کی رائے زرین کا اقرار ہوتا تو شاید اس قدر بجا معلوم ہوتا۔ دیکھو ایک لفظ کے بے محل ہونے سے سارا شعر کیسا بے مزہ اور سست ہو گیا۔ سرید احمد خاں کے ایک مضمون میں ہے ”جانوروں کی چھاتیاں“ اس لفظ کو وہ بے محل استعمال کر گئے۔ چھاتیاں انسان

کے ہوتے ہیں جانوروں کے تھن کہنا چاہئے بہت عرصے کا ذکر ہے لکھنؤ میں یہ ہوا چل گئی تھی کہ شاعروں نے چھاتیوں کے معنی میں جو بن کہنا شروع کیا تھا۔ اسی زمانہ میں مرزا داغ مرحوم رامپور سے کلکتہ میں وارد ہوئے اور نہایت ذوق شوق سے مٹیا برج میں آکر شعرائے سب سے سیارہ ملازمین واجد علی شاہ طاب ثراء سے ملاقات کی، دعوتیں ہوئیں، مشاعرے ہوئے، مجھ سے ان مرحوم سے پہلے انھیں صحبتوں میں ملاقات ہوئی ہے ان کا کہنا مجھے یاد ہے کہ جو بن چھاتیوں کے معنی میں ہرگز نہیں ہے۔ اب جسے دیکھئے وہ جو بن کو انھیں معنوں پر باندھنا ہے۔ یہ اعتراض ان کا بجا تھا۔ جو بن ان معنوں پر لکھنؤ کی زبان ہے نہ دہلی کی، تازگی لفظ کی فکر نے کبھی تو کلام کو مغلق بنا دیا یا قہر۔ جزو مد، رشک وغیرہ کے کلام میں بہت ہے ان لوگوں نے ایسے ایسے الفاظ باندھنا شروع کر دیے جن سے نصیحا احتراز کرتے ہیں ایک طرح ہوئی ”عقبا ہوں اور دریا ہوں“ مشاعرے میں میر دوست علی خلیل بھی گئے میر صاحب اور ان کے تلامذہ کی غزلوں میں الفاظ غریب و رکاکت ترکیب دیکھ کر انھیں دلگی سوچھی، وہاں سے جو اٹھے تو جس سے ملاقات ہوئی یہی کہا کہ یہی کیا شعر میر علی اوسط نے پڑھا ہے سن کے جی بے چین ہو گیا۔

اڑائے پھرتی ہے باد مخالف مجھ کو گردوں پر نہیں معلوم چھپتی ہوں کہ چھپتی کا پچھلا ہوں، پڑھنے کا انداز ایسا کہ جس نے سنا اسے یقین آگیا۔ لکھنؤ تھا لوگ لے اڑے یہاں تک نوبت پہنچی کہ بعض احباب اخلاص مندرنجیدہ ہو کر میر صاحب کے پاس گئے اور تخلیہ میں ان سے کہا کہ آپ کیا ستم کرتے ہیں بھلا یہ مضمون کہنے کا تھا۔ ۶ ”نہیں معلوم چھپتی ہوں کہ چھپتی کا پچھلا ہوں“ میر صاحب سنکر بہت خفا ہوئے کہ کس مردود نے کہا ہرگز میرا شعر نہیں سب کو فکر ہوئی کہ یہ دلگی کس نے کی۔ آخر روایات کا سلسلہ خلیل پر منتہی ہوا۔ جس زمانہ میں جو بن اچھلا تھا اکثر لوگوں نے چوکھا اٹھکا۔ اچھوتا وغیرہ کا بھی استعمال سچل کرنا شروع کیا اور وہ چل نکلا اور اب تو بہت شائع ہے لکھنؤ میں ایک صاحب نے اپنے استاد کا یہ مصرعہ (بت دیالی کے نہیں چاند سے تصویریں ہیں) میرے سامنے پڑھا میں نے پوچھا دیالی کیا چیز انھوں نے کہا میر صاحب فرماتے تھے کہ دوالی اسل میں دیا دالی رات ہے کثرت استعمال سے داؤ گر گیا دیالی رہ گیا لوگ دوالی غلط کہتے ہیں۔ میں نے کہا ایک تو دوالی کا لفظ غزل میں باندھنا مکروہ معلوم ہوتا ہے دوسرے دوالی رات میں سے داؤ کو آپ کیوں گراتے ہیں۔ کو کیوں نہیں گراتے، دوالی صحیح ہو جائے اور محاورہ بھی یہی ہے اس میں تصرف کرنے کی کیا وجہ اس کے علاوہ یہ کہ ہندی الفاظ کی تصحیح کرنا کب درست ہے بعض الفاظ قدیم زبان کے متروک بھی ہیں اور پھر بولے بھی جاتے ہیں جیسے چاندی کے بدلے روپا کہنا، گرہ لگانے کے عوض گانٹھ لگانا۔ قرص لینے کے مقام پر ادھار لینا متروک و مکروہ ہے۔ لیکن سونا، روپا، گانٹھ، گرہ کسی پر ادھار کھانا محاورہ میں اب بھی داخل ہے۔ بندھے ہوئے محاورے میں یہ بھی کچھ ضرور نہیں کہ اہل زبان جتنے لفظ بولیں وہ سب فصیح ہوں اہل زبان میں عوام میں بھی تو ہیں جنھیں حسن و قبح الفاظ کا کچھ حس نہیں، کسی نہ کسی طرح ادائے مطلب کر دینے سے کام ہے ان کے ہر محاورہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کو ادائے مطلب کے لئے الفاظ نہیں ملتے۔ کہتے ہیں کہ کپڑے چکٹ ہو گئے یا کہیں گے کپڑے ادھل پھل ہو گئے۔ کپڑے غارت ہو گئے۔ پٹنگ جھولی ہو گیا یا جھلنگا ہو گیا۔ محاورات ایسے نہیں ہیں جن سے تازگی یا حسن پیدا ہو تازگی اسے کہتے ہیں۔ جیسے نسخ نے اس شعر میں کی ہے

میرے گھر کی راہ کتر اگر نکل جاتا ہے چاند ہوتی ہے فرقت کی شب باہر ہی باہر چاندنی،

لیکن یہ شعر بھی شیخ صاحب کا سنئے۔ میل کی بٹی کسی نے نظم نہ کی ہوگی

بتی اس کے میل کی بٹی اگر کی ہو گئی، ریزہ ریزہ میل صندل کا برادہ ہو گیا

فتح الدولہ برق شاگرد رشید تھے کہا کرتے تھے مجھ نالایق نے بادشاہ کی مصاحبت اختیار کر کے اپنے فن کو زلیل کیا۔ مجھے تو چاہئے تھا کہ شیخ صاحب کی قبر پر بیٹھ رہتا۔ استاد کا یہ مضمون ایسا انھیں پسند آیا کہ آخر حیرا ہی لیا ہے

رنگ و بو میں گل سے وہ گلرو زیادہ ہو گیا میل تن پر لال صندل کا برادہ ہو گیا

غالب کہتے ہیں:- ”بارے طبیعتوں کے تو چالاک ہو گئے“۔ صیغہ جمع جیسا اس مصرع میں مجھے بہت لطف دیتا ہے۔

جو لوگ اہل زبان ہوتے ہیں کبھی وہ نیا لفظ وضع کر لیتے ہیں یا لفظ میں خوبصورت تصرف کرتے ہیں، میرا تمیس اپنے کلام کی تشبیہ میں پچھڑی

کو اوجھا لفظ سمجھے گلچھڑی باندھ گئے۔ میرا ایک شعر ہے۔

نہیں رنگ چین کو پائدار سی

یہ سمجھو فصل گل ایک گلچھڑی ہے

بعض اصحاب نے یہ شعر سنکر کہا کہ میرا نیس نے گلچھڑی کو گلچھڑی باندھا ہے کیا آپ اس تصرف کو اچھا نہیں سمجھتے۔ میں نے کہا میرا صاحب نے درج میں اس لفظ کو صرف کیا ہے اور میں نقش و نگار زمانہ کی مذمت کر رہا ہوں مجھے اس کی ضرورت نہیں کہ مشبہ بہ کی رونق بڑھاؤں۔

میر صاحب کے اس شعر پر اعتراض ہوا تھا:۔ ”گھوڑے نے آکے غیظ میں دانت اپنے کڑا کر اٹے“۔ یعنی سردی سے دانت کڑا کر اٹے ہیں اور غیظ میں دانت کٹ مٹاتے ہیں۔ اس اعتراض کا جو کچھ جواب ادھر سے ہوا ہونے میں نہیں آیا۔ مگر میں عرض کرتا ہوں کہ معترض نے کڑا کر اٹانے اور کٹ گمانے میں جو امتیاز کیا ہے وہ آدمی کے دانتوں کے لئے ہے۔ میر صاحب نے گھوڑے کے دانتوں کو کہا ہے۔ اُن کا مطلب یہ ہے کہ گھوڑا غیظ میں بھی دانت کڑا کر اٹاتا ہے کٹ مٹاتا نہیں۔ اس کو ارتجال لفظ کہتے ہیں اور یہ ہر شخص کا کام نہیں ہے۔ افسوس ہے ارتجال لفظ کی نظیریں زیادہ نہیں ملتی۔ مگر ہزل و مسخر میں اکثر لوگوں کو میں نے دیکھا کہ کچھ الفاظ انھوں نے کہے جو باعتبار وزن و ترکیب نہایت مضحک تھے اور ایک لفظ بھی با معنی نہیں تھا۔ مثلاً ایک بنگالی طالب علم قرأت سیکھنے کے لئے کوسوں سے ہر روز میا برج میں آیا کرتا تھا میں نے ایک دن اُس کا نام پوچھا۔ ابھی اُس نے جواب نہیں دیا تھا کہ ایک صاحب بول اُٹھے کہ ان کا نام ہے چیتیک الدین۔ میں نے پوچھا آپ کو ان کا نام کیونکر معلوم ہو گیا کہا کہ ان لوگوں کے نام میں دین ضرور ہوتا ہے۔ میں نے کہا کہ دین کے لفظ کو تو میں سمجھا۔ لیکن چیتیک کے معنی تو بتائیے، کہنے لگے آپ کو قرأت کا بہت شوق ہے بے قرأت کے بات ہی نہیں کرتے میں نے کہا کہ خیر قرأت کا قات لے لیجئے۔ لیکن سچ اور پپ کی شرح باقی ہے، انھوں نے جواب دیا کہ یہ دونوں حرف چیت سے ماخوذ ہیں۔ (اس کا سلسلہ اب مارجی ۲۵ء سے شروع ہوگا)

فرانکلن عہد حاضر کا پہلا شخص تھا جس نے پتنگ ڈور اور کنجی کی مدد سے برقی قوت معلوم کرنے کی کوشش کی لیکن سرزمین مصر کے حضرات سے پتہ چلا ہے کہ اب سے ۳۰۰ سال قبل اہل مصر الکٹرک پٹنگ *Electrum* کے لئے استعمال کرتے تھے

بارود اور چھاپہ خانہ جو موجودہ تہذیب کی بنیادیں، قدیم چین کی چیزیں ہیں۔ شنگھائی اور کوریہ سانچوں سے مٹی کے ٹاپ بنا کر پکالتے تھے اور ان سے کتابیں چھاپتے تھے۔ اس طرح قدیم ہندوستان میں لکڑی کے ٹاپ سے کتابیں چھاپنے کا کام لیتے تھے

ہشیار کی قیمت بالاقساط ادا کرنے کا طریقہ آجکل عام ہے، لیکن عراق کے کھنڈروں سے جو مٹی کی تختیاں برآمد ہوئی ہیں ان سے پتہ چلتا ہے کہ مسیح سے ۲۱۸۰ سال قبل وہاں بھی خرید و فروخت کا یہ طریقہ رائج تھا

اب گیارہ سو سال قبل افریقہ میں بعض حبشی حکام متوں میں کپڑا بننے کے کارخانے متعدد پائے جاتے تھے جن میں رنگین مٹل طیار کی جاتی تھی

سڑکوں کا باقاعدہ طیار کرنا اور اس کے دونوں طرف درختوں کا نصب کرنا نئی چیز نہیں، مہنجو ڈارو کے کھنڈروں سے پتہ چلتا ہے کہ تین ہزار سال قبل مسیح وہاں شہروں کی تعمیر بالکل حفظان صحت کے اصول پر ہوتی تھی، سڑکیں کشادہ بنائی جاتی تھیں اور ہر گھر میں ایک غسل خانہ ضرور بنایا جاتا تھا

علوم کی سرنگ یروشلم تک پانی لانے کے لئے ۱،۰۰،۰۰۰ فٹ کی چٹان کھود کر بنائی گئی تھی۔ اتنی کشادہ تھی کہ آدمی آسانی سے اس کے اندر سے گزر جاتا تھا۔ یہ سرنگ مسیح سے ۷۰۰ سال قبل، ہتھوڑے، چھینی اور برے کی مدد سے بنائی گئی تھی۔

فانی بدایونی

(تقابلی مطالعہ)

فانی کی زندگی مرتبہ یاس و حراماں تھی، کبھی غم معاش ہے تو کبھی مرگ پدر کا رنج۔ کبھی والدہ کی مفارقت کا الم ہے تو کبھی لڑکوں کی طرف سے مایوسی، لڑکی جو ان کو بہت عزیز تھی وہ بھی جاتی رہی اور آخر میں بیوی کے سانحہ ارتحال نے فانی کے لئے احساس غم ہی کو اصل زندگی بنا دیا۔ فانی موت اور زندگی کے درمیان ہمیشہ ٹھوکریں کھاتے رہے، موت نے جب آنکھیں دکھائیں تو حیات کی طرف پلے اور جب حیات نے پریشان کیا تو موت کو آواز دی۔ فانی کی یہی زندگی تھی

زندگی سے ہو بیزار فانی اس سے کیا حاصل موت کو منالوگے جان سے خفا ہو کر
فانی کا ہر شعر ان کے راز و رول کا ترجمان ہے۔ اور ملتیں کی تینوں شرطیں (سادگی، اصلیت اور جوش) ان کے ہر شعر میں موجود ہے
میر اور فانی کی زندگیوں ہر معاملہ میں کچھ اس قدر مشترک ہیں کہ ان کا انعکاس مشکل ہو گیا ہے، میر کو ساکنان اکبر آباد کی بے مہربانی کی شکایت تھی تو فانی اہل وطن کے عناد کے شانی تھے، میر اگر تنگی معاش سے تنگ آ کر دلی گئے تو فانی کو حیدر آباد جانا پڑا۔ میر کو جس طرح لکھنؤ کے قیام میں امن و سکون میر نہیں آیا اسی طرح فانی کو حیدر آباد کی اقامت گزینی سے آرام اور راحت نصیب نہیں ہوئی، میر میں اگر خودی اور خوداری تھی تو فانی بھی اس معاملہ میں کچھ سمجھتے نہیں تھے۔ دونوں کو حفظ وضع کا خیال۔ دونوں ناکام اور دونوں کو تنگی معاش کی شکایت۔ اس لئے دونوں کے کلام میں بھی مماثلت ہونا چاہئے۔

میر کے یہاں آہ و فغاں، مجبوری و بے کسی، ناکامی و نامرادی، بے ثباتی عالم اور ناپائنداری دنیا، عشق کی ستم انگیزی اور فقر و قناعت انکی غزل کی نمایاں خصوصیات ہیں اور وہ انھیں کو اپنے مخصوص انداز میں اس طرح بیان کرتے ہیں کہ سننے والے کلیجہ پکڑ کے رہ جاتے ہیں۔ کبھی وہ زبان اور طرز ادا کی سادگی سے یہ کام لیتے ہیں اور کبھی نثرنا فقر و میں یہ بات کہہ دیتے ہیں مثلاً:-

کہا میں نے کتنا ہے گل کا ثبات	کلی نے یہ سن کر تبسم کیا
کھلنا کم کم کلی نے سیکھا ہے	تیری آنکھوں کی نیم خدائی سے
فقرانہ آئے صدا کر چلے	میاں خوش رہو ہم دعا کر چلے

فانی کی طبیعت بھی اسی سوز و گداز، یاس و حراماں اور درد کرب کا مجموعہ تھی۔ مگر فانی اسی غم کو غم جاوداں جانتے ہیں، جذبات کی تیزی اور احساسات کی شدت میں وہ میر صاحب سے بہت نزدیک ہیں۔ مثلاً:-

آج ہم پی سکے نہ وہ آنسو	اُن کے آگے جو بار بار آیا
کس سے اب درد کی دوا چاہوں	درد اٹھتا ہے لے کے تیرا نام
آس ہوتی تو اس سہارے پر	صبر ممکن نہ تھا مگر کر لے
جب پریش جاں وہ کرتے ہیں کیا جانے کیا ہو جاتا ہے	کچھ یوں بھی زباں نہیں کھلتی کچھ درد سوا ہو جاتا ہے
دل کو کس دن قرار آیا تھا	تم کسے بے قرار کر کے چلے

اور تسلی سے سوا ہو گیا ،
اب بھی ترا وعدہ وفا ہوا نہ ہو
دردِ جگر ! یہ تجھے کیا ہو گیا
موت کا وعدہ تو وفا ہو گیا
اک مہمہ ہے سمجھنے کا نہ سمجھانے کا
زندگی کا ہیکو ہے خواب ہے دیوانے کا

فانی نے جو غزلیں بحرِ مقارب میں کہی ہیں ! لکل میر کے کدنگ کی ہیں اور بعض وقت فانی پر میر کا رنگ اتنا چھا جاتا ہے کہ وہ میر صاحب کے زمانے کے الفاظ و فقرات کے استعمال سے بھی احتراز نہیں کرتے ہیں۔ مثلاً :

غم کے ٹھوکے کچھ ہوں بلا سے آکے جگا تو جاتے ہیں
ہم ہیں مگر وہ نیند کے ماتے، جاگتے ہی سو جاتے ہیں

کیا چھپاتے کسی سے حال اپنا
جی ہی جب ہو گیا نڈھال اپنا
دل کا اجر نا سہل ہے، بسنا سہل نہیں ظالم
بستی بسنا کھیل نہیں، بتے بتے بستی ہے

آبادی بھی دیکھی ہے، دیرانے بھی دیکھے ہیں
جو اجرے اور پھر نہ بے، دل وہ نرالی بستی ہے

باوجود اس کے فانی، میر نہیں، سوا سوبرس کی زبان اور میر کے سوز و گداز نے مل کر فانی کے کلام میں جو دلاویزی اور دلکشی پیدا کر دی ہے وہ کہنے کی نہیں سوس کرنے کی چیز ہے۔ میر صاحب کی طرح فانی رنج و غم سے گھبراتے نہیں۔ بلکہ اس میں ان کو سکون نصیب ہوتا ہے :-

غم مجسم نظر آیا تو ہم انساں سمجھے
میر صاحب جبر کے قابل ہیں مگر فانی کا عقیدہ جبر و اختیار کے درمیان ہے :-
برق جب جسم سے وابستہ ہوئی جاں سمجھے

گناہ گار کی حالت ہے رحم کے قابل
گلشنِ تصویر میں تھے طائرِ تصویرم
غرب کشمکش جبر و اختیار میں ہے
کیا کہیں، کیونکر ہے، مجبور بھی آزاد بھی

میر کے اسلوب بیان میں حسرت، سوز و گداز، اثر، دلکشی اور روانی پائی جاتی ہے مگر فانی کے یہاں یہ چیزیں نسبتاً کم ہیں، میر کے کلام میں فلسفہ و حکمت کا دخل نہیں ہے، مگر فانی کے کلام میں بکثرت پایا جاتا ہے۔

غالب اور فانی غالب کا رنگ کلام کئی رنگوں کا مجموعہ ہے، مرزا بیدل کی ترکیبیں، میر کا درد و غم، نظیری کا تغزل، عرفی کی جدت آفرینی کے امتزاج سے غالب کا رنگ طیار ہوا ہے، فانی کی طبیعت بھی غالب کی طرح نکتہ رس اور حکیمانہ واقع ہوئی ہے۔ جس چیز سے ان میں ابتہاجی یا انقباضی کیفیت پیدا ہوتی ہے، اس کی حقیقت معلوم کرنے کی وہ سعی کرتے ہیں، ملاحظہ فرمائیے :-

غالب :- لو، وہ بھی کہتے ہیں کہ یہ بے ننگ و نام ہے
یہ جانتا اگر تو نثانا نہ گھس کو میں

فانی :- بہلانہ دل، نہ تیرگی شام غم گئی
یہ جانتا تو آگ لگاتا نہ گھس کو میں،

غالب :- عشرتِ قطرہ ہے، دریا میں فنا ہو جانا
درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا

فانی :- قطرہ قطرہ رہتا ہے، دریا سے جدا رہ سکتے تنگ
جو تاب جدائی لانا سکے، وہ قطرہ فنا ہو جاتا ہے

فانی نے اپنی قادر الکلامی سے غالب کے رنگ کو اور زیادہ چمکھا بنا دیا۔ ملاحظہ فرمائیے

آزردہ تھا کہ ضبطِ فغاں میں اثر نہیں
شرمندہ ہوں کہ ضبطِ مرارائیگاں نہ تھا

اللہ سے بے نیازی آدابِ انصاف
دیکھا مجھے تو پائے نظر درمیاں نہ تھا

اٹھتی نہیں ہے، تہمتِ نظارہ کجماں
منہ دیکھتا ہوں جلوہ نظارہ ساد کا

سنگ در دیکھ کے سر یاد آیا
کوئی دیوانہ مگر یاد آیا

فانی کو غالب سے جو چیز ممتاز کرتی ہے وہ بیان کی شگفتگی ہے۔ یوں تو زندگی کی حقیقت اُجاگر کرنے میں دونوں نے مجربات ہی کو سامنے رکھا ہے مگر فانی نے اس کے ساتھ الفاظ و تراکیب کی شگفتگی اور دلاویزی کو ہاتھ سے جاتے نہیں دیا، غالب کا شعر مخاطب کا محتاج ہے۔ بخلاف اس کے فانی کے

یہاں خود خطاب ہے اور اسی سے ان کی آواز، غیب کی آواز معلوم ہوتی ہے۔ علاوہ اس کے فانی نے ہر موقع پر دلیل کو سامنے رکھا۔ ملاحظہ فرمائیے:-

غالب :- ہستی کے مت فریب میں آجائیو است
فانی :- ہو مزدہ نگاہ غلط، جلوہ خود فریب
غالب :- ہو غیب، غیب، جس کو سمجھتے ہیں ہم شہود
فانی :- تجلیات و ہم ہیں مشاہدات آب و گل
عالم تمام حلقہ دام خیال ہے
عالم دلیل گرہی پشیم و گوشش تھا
ہیں خواب میں ہنوز جو جاگے ہیں خواب میں
کرشمہ حیات ہے، خیال وہ بھی خواب کا

فانی نے اسی خیال کو دوسری جگہ جوشِ خلوص کے ساتھ ظاہر کیا ہے اس کی داد نہیں دی جاسکتی:

غالب کا شعر ملاحظہ فرمائیے :-
اک مہم ہے سمجھنے کا نہ سمجھانے کا،
زندگی کا ہیکو ہے خواب ہے دیوانے کا

ہاں کھائیو مت فریب ہستی،
ہر چند کہیں کہ ہے، نہیں ہے،
فانی نے اسی مفہوم کو اس طرح پیش کیا ہے :-

غالب کے یہاں قطعیت ہے اور فانی کے یہاں محویت۔ غالب کے یہاں نفی محض ہے اور فانی کے یہاں اثباتیت۔ دونوں نے وحدت الوجود پر طبع آزمائی کی ہے ملاحظہ فرمائیے :-

غالب :- تھا جب کچھ، خدا تھا کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا
”کیا ہوتا“ کے اندر جو معنویت پائی جاتی ہے اس کا جواب نہیں، مگر فانی نے انسان کے احساسِ اتانیت کا فلسفہ بڑی خوبی سے ظاہر کیا ہے :-

میرا وجود ہے میری نگاہ خود شناس
دو راز ہوں کہ نہ ہوتا جو راز داں ہوتا
بلند خیالی مومن کے کلام میں درجہ آتم موجود ہے مگر بعض وقت اشکال پیدا کر کے شعر کی لطافت کو ختم بھی کر دیتے ہیں۔ مومن کو ترکیبوں کی تراش و خراش میں یرطولی حاصل ہے۔ مومن کے عشق میں رکاکت نہیں ہے۔ جیسے وہ خود دار تھے، ویسا ہی ان کا عشق بھی خود داری کے جذبول سے معمور تھا، اسی لئے مومن کے کلام میں وہ تمام کیفیات پائی جاتی ہیں جو حسن و عشق کی دنیا میں پیدا ہوتی ہیں۔
فانی کے کلام میں بھی معنی آفرینی اور نزاکت خیال کی مثالیں بکثرت ملتی ہیں مگر ان کی معنی آفرینی مومن کی معنی آفرینی سے مختلف ہے۔ مومن کی معنی آفرینی میں اس درجہ غرق ہو جاتے ہیں کہ مفہوم کا دامن ہاتھ سے چھوٹ جاتا ہے مگر فانی کی معنی آفرینی متما نہیں بنتی۔ مومن تراکیب نو کے اختراع کے شوقین ہیں مگر ترکیب کی پیچیدگی عام فہم سے بالا ہو جاتی ہے اور فانی کی دلکش ترکیبیں اس قسم کی نہیں ہیں، مومن کے کلام میں جہاں خیال کی بلندی ہے وہاں عموماً الجھن بھی ہوتی ہے، فانی کے یہاں یہ بات نہیں ہے۔ مثلاً :-

تم سے نسبت ہے اعتبار اپنا
ہم تمہارے ہیں ورنہ پھر ہم کیا،
بھی اک التفات ہے ورنہ
دعوتِ نالہ ہائے پیہم کیا
کمال ضبطِ غم عشق ارے معاذ اللہ
کہیں کہیں سے جو یہ ماجرا بیاں ہوتا
جلوہ اختیار سے نسبت جبر ہے مجھے،
شعلہ آرمیدہ ہوں وادی برق ناز میں

مومن مذرت ادا، دلکش تراکیب اور خوبصورت بندشوں کے اختراع کرنے میں جہاں مشہور ہیں، وہیں اپنے مقطع کے اعتبار سے ہر کہ و مر کہی زبان پر چڑھے ہوئے ہیں۔ یہ چیز فانی کی شاعری کا بھی نمایاں جوہر ہے ملاحظہ فرمائیے :-

کسی کے غم کی کہانی ہے زندگی فانی،
خاک فانی کی قسم ہے تجھ اے دشتِ جنوں
زمانہ ایک فسانہ ہے مرنے والوں کا
کس سے سیکھا ترے ذروں نے بیا بیاں ہونا

چمن سے رخصت فانی قریب ہے شاید
کس کی کشتی نہ گھر داب فنا جا پہنچی
کچھ اب کی بوئے کفن دامن بہار میں ہے
شور لبیک جو فانی لب ساحل سے اٹھا
موت سے ہو رہے ہیں ناز و نیاز

داغ و امیر اور فانی
داغ کے رنگ سے کون واقف نہیں، شعر آیا اور داغ پہچانے گئے۔ ان کی روانی ہلاست فوراً اپنی طرف متوجہ کر لیتی ہے
بیان میں شوخی، تیکھا پن، بانگین، بیساختگی ہے، معشوق سے بے محابا باتیں کرنا، جلی کٹی سنانا، لعن طعن کرنا، انکا
کام ہے۔ امیر کا بھی یہی رنگ ہے مگر وہ لاگ ڈانٹ، چھین جھپٹ میں امیر پیچھے رہ جاتے ہیں، امیر ادب کو ملحوظ رکھتے ہیں۔ مگر داغ، جرأت کی طرح
آزاد ہے۔ فانی کے یہاں جستہ جستہ داغ و تیر کے رنگ کے اشعار بھی موجود ہیں۔ یہ اشعار اس وقت کے ہیں جب فانی لکھنؤ میں وکالت کرتے تھے۔ ملاحظہ فرمائیے

ہے کفن گردِ کد، دیکھ نہ میلا ہو جائے
آج ہی ہم نے یہ کپڑے ہیں نہا کے بدلے
اداسے آہ میں خنجر کے منہ چھپائے ہوئے
مری قضا کو وہ لائے دو لہن بنائے ہوئے
آل سوز نہائے نہانی دیکھتے جاؤ
بھڑک اٹھی ہے شمعِ زندگانی دیکھتے جاؤ
مرا قتل کن کے ہاتھوں یہ تو باتیں،
کچھ ان کی ہیں، کچھ ان کے نامہ بر کی
تم کیوں تھے آئینہ خانے میں بے حجاب
اچھا ہوا کہ شرم و شرارت میں چل گئی
تربت کے پھول شام سے مرجھا کے رہ گئے
رو رو کے صبح کی مری شمع مزار نے

فانی پر لکھنؤ کے قیام تک لکھنویہ کا اثر رہا۔ لیکن بعد کو یہ رنگ اڑ گیا۔ ان فرض فانی نے تیریں، نہ غالب، نہ مومن ہیں، نہ امیر و داغ مگر پھر بھی سب
کچھ ہیں اگر امیر کا درد و غم، غالب کا فلسفہ و تصوف، مومن کی بلند حیالی اور نزاکت، ندرت اور ترکیب الفاظ۔ امیر و داغ کی شوخی ان سب کو ملا دیا جائے
تو فانی کی شاعری کا درجہ بہ آسانی متعین کیا جاسکتا ہے۔

فانی کے کلام کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ ان کی زندگی کی آئینہ دار ہے اور اسی لئے ان کی زندگی کے ہر موڑ کے ساتھ ان کے کلام کا رخ
بھی بدلتا رہا۔ فانی کے یہاں سپردگی، پندار نیاز، احساسِ حسن، عرفانِ حیات کے شدید جذبات موجود ہیں۔ مگر ان سب میں غم کی جھلک بھی شامل ہے۔
سپردگی کا تقاضہ یہ ہے کہ شاعر اپنے کو بھول جائے۔ مگر فانی نے اپنی انفرادیت کو ہمیشہ سامنے رکھا اور اس طرح کا احترام حسن یا انکسارِ شوق کے مابین
میں خرابی نہ پیدا ہونے پائے یہاں تک کہ یہ جذبہ عجز و انکسار، غرور و عجز و انکسار بن گیا۔ غالب نے ایک ہی شعر میں معشوق کے علوئے مرتبت کے ساتھ اپنی خودداری
کو بھی قلم رکھا ہے۔ ملاحظہ فرمائیے :-

عشق نے غالب نکما کر دیا
ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے

مگر فانی کے یہ اشعار ملاحظہ ہوں :-

چُن لیا تیری محبت نے مجھے،
اور دنیا بامسختہ مل کر رہ گئی
بے ذوقِ نظر، ہزم تماشا نہ رہے گی
منہ پھیر لیا ہم نے، تو دنیا نہ رہے گی
اپنے کمالِ شوق پر، حشر کا دن ہے منہر
وعدہ دید چاہئے، دیدہ انتظار کیا
تا عرضِ شوق میں نہ رہے بندگی کی لاگ
اک سجدہ چاہتا ہوں ترے آستانِ سکور

جس حُسن سے فانی کو عرفانِ حیات حاصل ہوا، جس نے فانی کے احساسِ دادِ اک کو قوتِ عطا کی، جس نے زندگی کو انوار سے بھر دیا، فانی اس کو
کیسے بھول سکتے تھے :-

نورِ برق معرفت بخشا دل آگاہ نے
ورنہ پہلے سوزِ غم اک شعلہ خاموش تھا

فانی حُسن و سپردگی کے باوجود ہمیشہ اضطراب و خلش محسوس کرتے ہیں اور فانی کا اضطراب جس غم کا خلاق ہے وہ بجز موت کی مایوسی کے اور کچھ

نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جستجوئے غم میں جہاں ان کو عرفانِ حیات حاصل ہوتا ہے وہیں وہ موت سے بھی محبت کرنے لگتے ہیں:-

سکونِ قلب میسر ہے، موت ہی سے سہی	غرض کہ خاتمہ رنجِ اضطراب ہوا
تو کہاں تھی اے اہل، اے نامرادوں کی مراد	مرنے والے راہ تیری عمر بھر دیکھا کئے
کی قضائے مہرم نے زندگی کی غمخواری	درد کی دوا پہونچی درد بے دوا ہو کر
فانی کے جذبہ اضطراب کی تخلیق، محبت، خود داری، غم اور موانست کے جذبات کی آمیزش سے ہوئی۔ ان میں بعض جذبے ابدی ہیں۔	
قبر میں جب کسی طرح دل کی تپ نہ کم ہوئی	یاد خرام ناز نے حشر کا آسرا دیا،
سینہ فانی ہے یا بولا نگہ برقِ فنا	دل ہے یا رب یا بلائے آسمانِ اضطراب
بعد فنا بھی کم نہ ہوئیں بے قراریاں	لا تہ نہ تہ کوئی بجلی کفن میں تھی
اور فانی بڑ گئی بیتابی دل بعد مرگ	کیا نہیں مگر گرفتار بلا کیوں ہو گئے
سکونِ موت مری لاش کو نصیب نہیں	نہ مگر کوئی اتنا نہ بے قرار رہے

اگر فانی کے جذبات کا تجزیہ کریں تو معلوم ہوگا کہ وہ اپنی خوشی کو عین غم اور رنج کو حقیقی مسرت محسوس کرتے ہیں، اور ایک وقت وہ آجاتا ہے کہ وہ ہر مدعا سے اپنے کو محروم تصور کرنے لگتا ہے اور عدم حصول مدعا، انکا مدعا بن جاتا ہے، ملاحظہ فرمائیے:-

مری حیات ہے محروم مدعاے حیات

وہ رہ گزر ہوں جسے کوئی نقش پانہ ملا

فانی زندگی کی ہر بولچہ کو محبت کی بولچہ کی تصور کرتے ہیں، محبت ان کی رگ دپے میں اس طرح جاری و ساری ہے کہ دل کی ہر کھٹک، محبت کی کھٹک محسوس ہوتی ہے، وہ اپنے گریہ و ماتم سے دوست تو دوست دشمن کو بھی رلا دیتے ہیں وہ اپنے غم کا عکس تمام مظاہر میں موجود پاتے ہیں چہ شاعر ملاحظہ فرمائے

میں دردِ فرقت سے جاں بلب ہوں، تمہیں یقین و فنا نہیں ہے

مجھے نہیں اعتبار اپنا تمہیں نہیں اعتبار میرا

تیرا کرم کہ تو نے دیا دل دکھا ہوا

میری ہوس کو عیشِ دو عالم بھی تھا قبول

اک مٹایا داغ اک پیدا کیا

نذر دردِ دل، غمِ دنیا کیا

تو نے آہِ آتشیں یہ کیا کیا

بجلیاں بھر دیں نگاہِ یار میں

جان بھی قربان کی، اچھا کیا

زیست تھی بیکار فانی دل کے بعد

تم ابھی کیا دیکھتے ہو تھم کے خنجر دیکھنا

دیدنی ہے رنگِ دل میں ڈوب کے کھینچنے کے بعد

ہائے اُن ناشاد آہوں کا مقدر دیکھنا

سائنس کے جو آخری جھٹکوں میں ٹکڑے ہو گئے

آج تیرا نام لے کر کوئی غافل ہو گیا

سُن کے تیرا نام آنکھیں کھول دیتا تھا کوئی

زندگی مشکل ہی تھی، مرنا بھی مشکل ہو گیا

موت آنے تک نہ آئے اب جو آئے ہو تو ہائے

اب جان سے سیزا ہوا بھی نہیں جاتا

جاتے ہوئے کھاتے ہو مری جان کی قسمیں

مجھے نیاز ہوتا نہ وہ بے نیاز ہوتا

مرے شوق نے سکھایا، اسے شیوہ تغافل

کوئی تو اہل وفا کا مزاج داں ہوتا

تری جفا کے سوا بھی ہزار تھے انداز

ہم نے گن گن کے لئے خون وفا کے بدلے

کہ وفا یار سے ایک ایک جفا کے بدلے

فانی کے نزدیک محبت کا مقام بہت بلند ہے، یعنی جب انسان اپنے کو غم کی آگ میں اچھی طرح تپائے، ہر سائنس غم آلود ہو جائے، ہر شعاع نظر سے اندوہ کے شرارے اُڑنے لگیں، اس وقت انسان اس قابل ہوتا ہے کہ عشق و محبت کا دعویٰ کر سکے، فانی کی زندگی اس نظریہ محبت کی پوری طرح آئینہ دار ہے۔ وہ خود کہتے ہیں:-

باب المراسلہ والمناظرہ

استفادہ، سرقت و توار کی بحث

(فضا بن فیضی اعظمی)

مکرمی و مخلصی! — ”نگار“ ماہ اگست ۱۹۵۷ء کی اشاعت میں جناب افسر صاحب کے غم و غصہ کا گر جتنا ہوا بادل اور چڑھتا ہوا طوفان دیکھا خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ اس سے کتنے دل متاثر ہوئے ہوں گے، مگر زبان فضا پر یہی مصرعہ جاری تھا: ”ہم گفتمی و خرسندم عفاک اللہ لکھنوی“۔ اور اس ادلے خاص نے کہ ”فضا کا کلام اگر شایع ہوگا تو میں نگار کا مطالعہ بند کر دوں گا“ آپ کے دل کو بھی گرایا۔ ”نادک نے تیرے صید نہ چھوڑا زمانہ میں“۔ حضرت! میری خاموش فطرت اس کی متقاضی نہ تھی کہ کچھ عرض کرتا، اور نہ آلام و مکن ہی اس کی اجازت دیتے تھے، مگر آپ کے بے لاک تنقیدی جائزے نے مجھے مجبور کر دیا کہ چند کلمے بطریق معذرت پیش کر دوں — حقیقت یہ ہے کہ میں نہ شاعر ہوں اور نہ مجھے دعوائے سخن سنجی، جب کبھی طبیعت کسی چیز سے متاثر ہوتی ہے تو بے اختیار کہہ لیتا ہوں۔ اس سے نہ اظہارِ علم و فن مقصود ہے نہ جلبِ منفعت نہ علوئے مرتبت۔ ”نہ ستائش کی تمنا نہ صلہ کی پروا“۔

لاریب، جو فروگزاشتیں واقعی ہوں مجھے اس کے اعتراف میں عذر نہیں، میں اپنے ان بزرگوں کا ہمہ تن سپاس ہوں جو مجھ کو میری کمر و پیل پر کوئیں یقیناً وہ میرے محسن ہیں اور ہزاروں شکریہ کے مستحق — مجھے اپنی تمام انسانی کمزوریوں کے اعتراف کے باوجود اس امر کا یقین و اطمینان ہے کہ میں نے ہنگام فکر کبھی ایسی چیز کے اپنانے کی ناجائز کوشش نہیں کی جو دوسروں کی علامتیں اور خاص حقہ بن چکی ہوں۔ بلاشبہ ایک مخصوص طرزِ ادا، ایک خاص شیل اور شعر کی ہیئت مجموعی کسی موجد کی ملکیت ہوتی ہے، مگر الفاظ، محاورے اور امثال کسی کی میراث نہیں، نیز اکثر تشبیہات، استعارات، خیالات و نظریات میں اس درجہ توافق، یکسانیت اور عمومیت ہے کہ کسی کے کلام میں استفادہ، سرقت اور توار کا فرق کرنا دشوار ہے، اور استفادہ کو سرقت، سرقت کو قبیح، یا ارد کو سرقت اور سرقت کو توار کہنا آسان بھی ہے اور بہ نظر غائر دیکھا جائے تو سخت مشکل، ایک سرقت بتاتا ہے تو دوسرا سرقت تو کیا توار کا بھی شائبہ نہیں سمجھتا، نیا کہ آئندہ مثالوں سے معلوم ہوگا۔ یہ واقعہ ہے کہ قبیح و تقلید بزرگوں کا قدیم طریقہ رہا ہے حالانکہ وہ خود صاحب طرز تھے مگر دوسروں کے کلام کو معیاری چیز قرار دیکر ان کے قبیح کا اعتراف کرتے تھے اور صرف اعتراف ہی نہیں بلکہ اپنی شاعری کا سنگ بنیاد ان کے طرز سخن پر رکھا۔

علامہ شبلی خواجہ حافظ کے متعلق لکھتے ہیں: ”خواجہ حافظ نے غزل گوئی شروع کی تو خواجہ کے کلام کو سامنے رکھ کر کہنا شروع کیا“۔

خواجہ حافظ خود کہتے ہیں: — استفادہ غزل سعدی پیش ہمہ کس اما نہ وارد سخن حافظ طرز سخن خواجہ

امیر خسرو و امیر الشعراء ہیں بایں ہمہ خمنا نہ شیراز سے سرستی کا کیسا اعلان کرتے ہیں — خسرو سر مست ندر ساغر معنی برکت: شیراز خمنا نہ مستی کہ در شیراز بود مرزا صاحب اتباع حافظ کو لکھتے ہیں: — رواست صاحب اگر نصیت از رہ دعویٰ: قبیح غزل خواجہ گر چہ بے ادبی است

مرزا غالب کا مشہور شعر ہے: — ”پاتے نہیں جب راہ تو چڑھ جاتے ہیں“: رکتی ہے مری طبع تو ہوتی ہے رواں اور

کسی کا شعر ہے نام یاد نہیں رہا: — ”رکتا نہیں رو کے سے مراجعش طبیعت“: چشمہ رہ دشوار میں ہوتا ہے رواں اور

یہ شعر مرزا کے شعر کا ایک پر تو ہے جو قبیح و استفادہ کے حدود میں ہے — قبیح و استفادہ کے علاوہ بقول پروفیسر قادری صاحب بعض خیالات بعض مضامین

بعض اسالیب بیان، بعض ترکیبیں ایسی عام اور فطری ہوتی ہیں کہ اکثر آدمیوں کے ذہن میں بغیر کسی خاص غور و فکر کے آجاتی ہیں، ان کے استعمال پر سرتو کا الزام دینا

ظلم ہے۔ — عربی کا شعر ہے: — ”کافر تراست ز اہل ابرہہ و لیکن اور ابست است در سرور آستیں نداد

غالب کہتے ہیں: — ”من مذہب نہ کنی گر لباس دیں دارم ہفتہ کا فرم و بت در آستیں دارم

مرزا کے اس شعر کو عربی سے سرقت کے مثال میں پیش کیا جاتا ہے۔ حالانکہ سرقت کیا توار کا بھی شائبہ نہیں، ”رکت در آستیں و اشتق“ کا محاورہ سرقت کی دلیل سمجھا

جاتا ہے تو پھر محاورہ عام کیا ہوا ملکیت خاص ہو گیا مضمون دونوں شعر کے الگ الگ ہیں۔

شیخ سعدی کا شعر ہے: اس بیل اگر نالی من با تو ہم آوازم تو عشق گلے داری من عشق گل اندامے

خواجہ حافظ کا مطلع ہے: بنال بیل اگر بامنت سر یاری است کہ مار و عاشق زایم و کار بازاری است

کسی کا اردو شعر ہے: آغند لیب مل کے کریں آہ و زاریاں تو ہائے گل پکار میں چلاؤں ہائے دل

انصاف سے اگر دیکھا جائے تو شاعر اور بیل کا عشق اس قدر عام و مشہور ہے کہ یہ مضامین بغیر اخذ و سرقہ کے ذہن میں آسکتے ہیں۔

غالب کے اس شعر کو محرم نہیں ہے تو ہی نوا ہائے راز کا یاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا

عرفی کے اس شعر کا سرقہ کہا جاتا ہے: ہر کس نہ شناسندہ راز است و گردنہ این اہمہ راز است کہ مفہوم عوام است

تو عرفی کو حافظ کے اس شعر کا سارق کہنا چاہئے۔

حافظ: مصلحت نیست کہ از پرہ بردن افتد راز ورنہ در مجلس رنڈاں خبر نیست کہ نیست

لیکن دراصل اس مضمون میں اگر مضمون کی نوعیت پر غور کیا جائے تو سرقہ کا الزام بجائے ورنہ فارسی کے شعراء و متاخرین کی اکثر شاعری متقدمین و کلاسیکین

کا سرقہ ہو جائے گی اور پھر اردو شاعری تمام کی تمام بال سرقہ۔ سرقہ کی مثال میں مرزا کا یہ شعر بھی ہے:۔

مرزا بیدل: بوئے گل، نالہ دل، دود چراغ محفل جو تری بزم سے نکلا سو پریشان نکلا

ولی دکنی کا شعر ہے: ایسا بس ہے آکر تیرا خیال جیو میں ہر کہ از بزم تو برخواست پریشان برخاست

نظیری: نہ چناں گرفتہ جا تو میان جان شیریں کہ تو ان ترا و جاں راز ہم امتیاز کردن

اگر ایک زبان سے دوسری زبان میں ترجمہ کرنا جائز ہے اور مترجم سارق نہیں تو ولی پر سرقہ کا جرم عاید نہیں ہو سکتا اور مرزا کے متعلق بھی شاید۔

سرقہ اور توار کے علاوہ ایک اور صورت بھی واقع ہوتی ہے، وہ یہ کہ ایک شاعر دوسرے کے جواب اور اس کے مقابلہ میں طبع آزمائی کرے، یہ بڑی

نازل بات ہے، اس میں جواب و مقابلہ کا بہتر یا کم سے کم برابر ہونا ضروری ہے ورنہ سعی رائیگاں جائے گی۔

مرزا کا مقطع ہے: میں نے مجنوں پہ لڑکپن میں اسد شگ اٹھایا تھا کہ سر یاد آیا

میر حسین تسکین: کوچہ یار میں میں نے تسکین پاؤں رکھا تھا کہ سر یاد آیا

مومن خاں: دیدہ حیراں نے تماشا کیا دیر تلک میں اسے دیکھا کیا

داغ: آئینہ دل نے تماشا کیا اپنی جگہ میں اُسے دیکھا کیا

عرفی: حد کنہ توبہ ادراک نشاید دانست دیں سخن نیزہ اندازہ ادراک من است

مرزا کا مشہور شعر ہے: ہے پرے سرحد ادراک سے اپنا بچود قبلہ کو اہل نظر قبلہ نما کہتے ہیں

مومن خاں: تو کہاں جائے گی کچھ اپنا ٹھکانا کرے ہم تو کل خواب عدم میں شب بھر اٹھ کرے

طاہر: یار کے وعدہ فردا کی قسم سچ کہنا! کل ترے ٹھاٹھ کہاں لے شب بھر اٹھ کرے

عقصر مرزا پوری: اپنے گھر سے تجھے تنہا تو نہ جانے دیں گے صبح کو ہم ترے ساتھ لے شب بھر اٹھ کرے

ان شعروں میں جواب اور مقابلہ کی صورت ہے، ان کو سرقہ سے کوئی تعلق نہیں۔

چند شعراء و پیش ہیں جن سے اسلوب بیان اور طرز ادا کے فرق کا اندازہ ہوگا حالانکہ مصرعے کے مصرعے اور فقرے کے فقرے

یکساں ہیں۔

یہ زمرہ: انا المسوم ما عندی بتریاں و لاراں اور کا سا و نادہا الا یا ہا الساقی!

خواجہ حافظ :- الایا ایہا الساقی اور کاساؤ دادہا کہ عشق آساں نمود اول وے افاد شکلا
 شیخ سعدی :- اگر دشنام فرمائی وگر بخشی نہ قیمت لب عمل شکر ذرا جواب تلخ می زید
 خواجہ حافظ :- دم گشتی و خرم و عفاک اند کو گشتی :- جواب تلخ می زید لب عمل شکر ذرا
 شیخ سعدی :- ہر کس از دست غیر ناد کند سعدی از دست خویشین فریاد
 حافظ :- من از بیگانگان ہرگز نہ ناالم کہ با من انجہ کر آن آشنا مرد
 دبیر :- کس نے ہے دی انگوٹھی رکوع و جویں = انیس :- سایل کو کس نے دی ہوا انگوٹھی نمازیں
 دبیر :- آنکھوں میں پھرے اور نہ مردم کو خبر ہو = انیس :- آنکھوں میں یوں پھرے کہ مرثہ کو خبر ہو
 دبیر :- رویا میں بھی حسین کو دنیا ہی کرتے ہیں = انیس :- حسرت یہ ہو کہ خواب میں بھی دیا کرتے ہیں
 مولانا قاسمی :- خوشتر آن باشد کہ ستر دہراں گفتہ آید در حدیث دیگران
 مرزا :- ہر چند ہو مشاہد حق کی گفتگو بختی نہیں ہے بادہ و ساغر کے بغیر

غرض کہ یہ اشعار اور اساتذہ کے اور ہزاروں اشعار ایسے ہیں کہ جن میں کہیں استفادہ و تقلید ہے کہیں جواب و مقابلہ کہیں اپنے اسلوب میں خیالات کی ترجمانی ہے کہیں لفظی ترجمے، جن پر اصولاً سرقہ کا الزام عاید نہیں کیا جاسکتا۔ اور لطف یہ ہے کہ دنیا کے شاعری میں یہ کاروبار اسی طرح برابر جاری رہا، بلکہ سے باند تر مضامین و خیالات ایک دوسرے سے پیدا ہوتے رہے اور شاعری پر دامن چڑھتی رہی، اگر یہ طریقہ ممنوع قرار دیا جاتا تو یہ تنوع کلام میں نہ پیدا ہوتا اور نہ انکی ترقی ہوتی، اور یہ شوخی و رنگینی جو آج مرغوب خاطر ہے باقی نہ ہوتی۔ یہ بھی بزرگوں کا احسان اور کمال ہے کہ خیال سے خیال پیدا کر کے شاعری کو معراج ترقی پر پہنچایا۔ میں سمجھتا ہوں شاید جناب افسر صاحب کو کچھ اشتباہ ہو گیا، وہ تقلید و سرقہ میں فرق نہ کر سکے، اگر بالفرض کوئی کسی کے نظائریات و تصورات کی پیروی کو گنا ہے اور اس کا اپنا خاص اسلوب بیان اور طرز ادا ہے تو اس میں کیا حرج ہے، اس لئے کہ سرقہ میں "قصود و مادہ" کی شرط کے ساتھ اسلوب بیان کی مشابہت ہے اگر یہ بات انیس تو اصولاً اسے سرقہ نہیں کہنا چاہئے مگر افسر صاحب کے نزدیک یہ بھی ایک ایسا ناقابل معافی جرم ہے کہ جس کے لئے پتہ ذیل کی ضرورت ہوئی۔

بے ! مردانہ آن از دوسے تحقیق کہ چوں خشم آید شش باطل نہ گوید

اب جناب افسر صاحب کے چند مصرعے نوٹا پیش ہیں دیکھئے وہ اس کے متعلق کیا حکم لگاتے ہیں۔ اگرچہ میرے نزدیک الفاظ و محاورات یا تشبیہ و تمثیل جو کسی مقدم کے کلام میں متعلق ہیں ان کا ایراد متاخر کے لئے اصولاً نہ کوئی جرم ہے نہ سرقہ، حتیٰ کہ خیالات بھی بشرطیکہ اپنا انداز بیان ہو۔

افسر :-	وہ جاگیں قیصر و سنجری لاشیں	=	پر و فیہر شور :-	جاگتی دیکھی ہیں لاشیں قیصر و سنجری
"	چھٹک رہے ہیں لہو اہل عرش بستی پر	=	"	لہو شہروں میں چھٹک رہے ہیں گمشدائیں
"	کہ سیم وز کی بواؤں سے بچھ گئے ہیں ضمیر	=	"	ضمیروں کو بچھا دیں گی ہوا میں
"	دگرگوں ہے جہان سرخ و ماہی	=	اقبال :-	تری دنیا جہان سرخ و ماہی
"	میں نے دیکھے ٹمٹماتے عشق و ستی کے دئے	=	ساتی جاوید :-	ٹمٹماتے ہی رہے ہیں سیدوں کے دئے
"	کوئی شاخ ہے گلشن میں جو تلوار نہیں	=	گلبر :-	یہ شاخ گل بھی ہے تلوار بھی ہے
"	برگ گل کو تاج کے کانٹوں پہ تو لا جائیگا	=	جوش :-	کلی کو خار کے کانٹے پہ تو لٹا آجائے

اس سلسلہ میں جناب پر و فیہر قادری صاحب کی یہ بات قابلِ غور ہے کہ "اگر کسی مترانے اپنے مقدم سے بہتر یا برابر مضمون نکال دیا ہے تو اسے محانت رکھنا چاہئے اور اس کا فیصلہ اخذ کی نیت و حیثیت پر رکھنا چاہئے، اور اس معاملہ میں ذاتیات سے بڑھ کر ادبیات کی بحث پیش نظر رکھنی چاہئے۔"

مطبوعات موصولہ

پشتو لوک گیت مجموعہ ہے ان گیتوں کا جو پشتو بولنے والے پٹھانوں میں گائے جاتے ہیں۔ اس میں سات قسم کے گیتوں کو جمع کیا گیا ہے جو مختلف موقعوں پر مردوں اور عورتوں کی طرف سے گائے جاتے ہیں۔

ایک قوم کا صحیح مزاج سمجھنے کے لئے اس قسم کے گیتوں کا مطالعہ از بس ضروری ہے اور ہمیں عوام کے انہیں سادہ جذبات سے ان کے رجحانات و میلانات کا پتہ چلتا ہے۔ پٹھان قوم بڑی سخت دل اور ناعاقبت اندیش سمجھی جاتی ہے، لیکن ان گیتوں کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی فطرت ایسی نہیں ہے اور ان کے دل بھی حُسن و محبت اور ہمدردی و ایثار کے جذبات سے خالی نہیں۔ جناب فارغ بخاری نے ان گیتوں کے ساتھ ساتھ ان کا ترجمہ بھی اردو میں درج کر دیا ہے جو بہت سلیس ہے۔

کتابت و طباعت بہت پاکیزہ ہے۔ قیمت ڈھائی روپیہ۔ نیا مکتبہ قصہ خوانی پشاور

نالہ پابند نے مجموعہ ہے جناب اختر انصاری اکبر آبادی کی غزلوں اور نظموں کا۔ ابتدا میں جناب علی اختر حیدر آبادی اور جناب شاعر لکھنوی کے دیباچے نظر آتے ہیں جس میں انھوں نے کافی دشنام کے ساتھ اختر صاحب کے محاسن کلام پر روشنی ڈالی ہے۔

اس مجموعہ میں بڑا حصہ غزلوں کا ہے جن کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ ان کی زمین بالکل نئی ہے۔ اختر صاحب کو نئی زمینوں میں غزل لکھنے کا بڑا شوق ہے اور وہ اس میں اکثر جگہ بہت کامیاب ہوئے ہیں۔ اختر صاحب چونکہ اپنے میلانات کے لحاظ سے جدید دور کے شاعر ہیں اسلئے ان کے جذبات میں بھی کافی اپج پائی جاتی ہے۔ جذبات کے اظہار میں انھوں نے زیادہ فضول تصنع سے کام نہیں لیا ہے اور کوشش کی ہے کہ جو کچھ لکھیں معقولیت کے حدود کے اندر لکھیں۔

آخر میں چند گیت بھی ہیں اور وہ زیادہ کامیاب نہیں ہیں۔ کتاب مجلد شایع ہوئی ہے اور دور روپیہ میں حلقہ آراب فکر رتن تلاء و کراچی سے مل سکتی ہے۔

لسان العصر اس مجموعہ میں تمام ان قطعات و منظومات کو یکجا کر دیا گیا ہے جو حضرت اکبر الہ آبادی کی وفات پر لوگوں نے لکھی تھیں اور جن کی تعداد ۸۰ کے قریب ہے۔ یہ کتاب بزم اکبر کراچی کی طرف سے شایع ہوئی ہے اور اختر انصاری اکبر آبادی نے اسے مرتب کیا ہے۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اس مجموعہ کی اشاعت بے محل ہوئی ہے۔ اس کی اشاعت کا صحیح وقت وہ تھا جب اکبر کے تمام کلام اور اس کے سوانح شایع ہو جاتے۔

قیمت تین روپیہ ہے اور کتابت طباعت نہایت پسندیدہ، نئے کا پتہ بزم اکبر کراچی۔

جنوبی ہند میں دو ہفتے یہ مختصر سا سفر نامہ ہے جناب جگن ناتھ آزاد کا جو انھوں نے جنوبی ہند کی سیاحت کے دوران میں مرتب کیا تھا جناب آزاد کو گورنمنٹ آرٹس کالج مدراس کی طرف سے شرکت مشاعرہ کی دعوت دی گئی تھی لیکن وہ اس سلسلہ میں حیدر آباد بھی گئے اور مدراس کے دوسرے مقامات کی بھی سیر کی۔

آزاد کے جذبات خلوص و صداقت ایسے نہ تھے کہ ان کی قدر نہ کی جاتی۔ وہ جہاں پہنچے لوگوں نے انھیں سراٹھکھوں پر بٹھایا اور ان کی شاعری سے پورا لطف اٹھایا۔ جناب آزاد نے اسی داستان پذیرائی کو ایسے موثر و دلکش انداز میں بیان کیا ہے کہ اس کو شروع کر کے ختم کرنا ہی پڑتا ہے۔ قیمت ایک روپیہ اور نئے کا پتہ: دہلی کتاب گھر دہلی۔

ولی گجراتی نتیجہ ہے جناب سید ظہیر الدین مدنی ام۔ اسے پی ایچ ڈی کی ریسرچ کا جو انھوں نے ولی گجراتی کے سوانح اور شاعری کے متعلق کئی سال تک جاری رکھتی۔ ابتدا میں انھوں نے گجرات کی تاریخ نہایت شرح و بسط کے ساتھ بیان کی ہے اور پھر یہاں کے اہل فضل و کمال

کا ذکر کرتے ہوئے، اردو ادب کے نشوونما پر روشنی ڈالی ہے۔

وہی کو اس وقت تک دکنی شاعر سمجھا جاتا تھا، لیکن مدنی صاحب مختلف ذرائع سے اس کا گہرائی ثابت کیا ہے۔ وہی کے علمی استعداد اور ان کی شاعری پر بھی انھوں نے کافی بسیط گفتگو کی ہے۔ الغرض یہ کتاب معیاری ریسرچ کی چیز ہے اور ہمیں مدنی صاحب کا ممنون ہونا چاہئے کہ انھوں نے یہ کتاب لکھ کر اردو ادب کی تاریخ میں بڑا مفید اضافہ کیا ہے۔ قیمت چار آنہ اور انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ ممبئی سے مل سکتی ہے۔

نوائے بیدل مجموعہ ہے جناب عبدالمنان بیدل عظیم آبادی کی غزلوں اور نظموں کا۔ بیدل صاحب پٹنہ کالج میں اردو فارسی کے پروفیسر تھے اور ان مخصوص استادوں میں سے تھے جو علمی خدمت خالص علمی حیثیت سے انجام دیتے ہیں اور اسی سلسلہ میں ان کو شاعری کی طرف بھی متوجہ کیا ایک سحرے ذوق کا پڑھا لکھا شخص ہر کام سلیقہ سے کرتا ہے اس لئے بیدل صاحب کی شاعری بھی ان کے سلیقہ و ذوق کی آئینہ دار ہے۔

جناب بیدل متعدد مفید کتابوں کے مصنف ہیں جو اس سے قبل شائع ہو چکی ہیں، لیکن ان کے مجموعہ نظم کی اشاعت کی طرف غالباً اب بالکل پہلی بار توجہ کی گئی ہے اور یقیناً بیدل دربان دونوں کے ساتھ بالافاضانی ہوتی اگر ایسا نہ کیا جاتا۔

بیدل کی شاعری دراصل شاد اسکول کی شاعری ہے اور میں اس کو ایک علیحدہ اسکول اس لئے قرار دیتا ہوں کہ شاد عظیم آبادی کی شاعری یقیناً لکھنوی اور دہلوی اسکول سے مختلف تھی۔

عظیم آباد ہمیشہ سے اہل فضل و کمال کا مرکز رہا ہے اور اس کے لئے یہ امر باعث صد ہزار افتخار ہے کہ مرزا عبدالقادر بیدل ایسا شاعر اس نے پیدا کیا۔ پروفیسر عبدالمنان صاحب نے بھی اپنا تخلص بیدل رکھا ہے اور گو ان دونوں میں اول و آخر کی نسبت نہیں پائی جاتی، تاہم یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ انھوں نے شاد عظیم آبادی کے رنگ کو بڑی کامیابی کے ساتھ نبھایا ہے اور یہ آسان بات نہ تھی۔ مثلاً چند اشعار ملاحظہ ہوں :-

جب بے نیازیاں تھیں محبت بھی سہل تھی اب اس کے التفات نے مشکل بنا دیا
 قفس ٹوٹے نہ ٹوٹے لذت کو شمش تو ملتی ہو چنگ لینے دوسرے کو بال دہر سے کھیل لینے دو
 خبر نہیں مرا تنکوں کا ایک سیا کرنا ہے بکلیوں کے لئے یا کہ آشیاں کے لئے
 میں تو الفت میں ونا کر کے پشیمان ہوا دیکھنا تم نہ جفا کر کے پشیمان ہوتا
 خود اپنے ہاتھ سے چمن اپنا مٹا دیا شرمندہ برق سے ہیں نجل آسمان سے ہم

ان اشعار سے شاعر کی قوت بیان، ندرت ادا اور ہندی ذوق پوری طرح نمایاں ہے اور ملک کو اقبال ملک ڈیو پٹنہ کا ممنون ہونا چاہئے کہ اس نے اس مجموعہ کو شائع کرنے کی ذمہ داری اپنے سر لی۔ قیمت چار روپیہ، کتابت و طباعت پسندیدہ، کاغذ دبیرہ سفید۔

رفیق صحت لاہور یہ ایک طبی رسالہ ہے جسے جناب حکیم اقبال حسن نے لاہور سے جاری کیا ہے۔ اس وقت تک اس کے ردیفہر ترقی اور پائوری یا نمبر کے نام سے شائع ہو چکے ہیں اور ہر دفعہ بہت کامیاب ہیں۔ یہ دونوں مرض اپنی جگہ بڑے نامعقول ہیں جن میں علاج سے زیادہ تدابیر حفظ و اتقہ کی بڑی ضرورت ہوتی ہے۔ حکیم صاحب موضوعات نے نہایت وضاحت کے ساتھ ان امراض کے متعلق ان تمام باتوں کو ظاہر کر دیا ہے جن کا جائز ہر شخص کے لئے ضروری ہے۔ اسی کے ساتھ خود اپنے اور اپنے خاندان کے تجربہ کئے ہوئے نئی بات لکھ کر بڑی مفید خدمت انجام دی ہے۔ یہ التزام کہ ہر نمبر کسی نہ کسی مرض کے لئے مخصوص ہو بڑی سودمند کوشش ہے اور ملک کو اس سے ضرور فائدہ اٹھانا چاہئے

اس رسالہ کا سالانہ چند حکیم صاحب نے صرف دو روپیہ اس لئے رکھا ہے کہ عوام زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھا سکیں۔ نمونہ اہل بیت سے طلب کیا جائے حکیم اقبال حسن صاحب مفصل دربارہ آنا گنج بخش لاہور۔ ہندوستان میں جو صاحب اس کو لینا چاہیں وہ اپنا چند دفتر نگار میں بھیج سکتے ہیں۔

مکتبہ اردو لاہور سے ہر سال ایک مجموعہ کچھ سال کے بہترین مقالات و منظومات کا شائع ہوتا رہتا ہے چنانچہ اس سال بھی حسب معمول شعبہ کے بہترین ادب کے نام سے یہ مجموعہ شائع کیا گیا ہے جو ۵۱۲ صفحات کو محیط ہے۔

۱۹۵۷ء کا بہترین ادب

اس انتخاب میں آٹھ مقالے، دس افسانے، ایک ڈراما، ۲ نظمیں، ۱۳ غزلیں اور پانچ مزاحیہ مضامین ہیں جو سب کے سب پہلے انہیں نہ کہیں شایع ہو چکے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ انتخاب کا مسئلہ بڑا مشکل ہے، لیکن ہمیں یہ دیکھ کر خوشی ہوتی ہے کہ جس حد تک مقالات کا تعلق ہے ان کے معیاری ہونے سے کسی کو اختلاف نہیں ہو سکتا۔ فسانوں اور غزلوں کے بابت بھی ہم یہی کہہ سکتے ہیں، لیکن منظومات میں البتہ بعض ایسی ہیں جن کے معیاری ہونے کے متعلق اختلاف ہو سکتا ہے، تاہم وہ اس قدر کم ہیں کہ انہیں ”خالِ رنجِ زیبا“ سمجھ کر گوارا کیا جاسکتا ہے۔

اس مجموعہ میں عہد حاضر کے مشہور ادیبوں و فسانہ نگاروں کے علاوہ ایک دو ایسے ستارے بھی ہیں جو حال ہی میں طلوع ہوئے ہیں لیکن ان کا مستقبل کافی درخشانی نظر آتا ہے۔

یہ مجموعہ مجلد نہایت عمدہ کاغذ پر بہترین طباعت و کتابت کے ساتھ شایع کیا گیا ہے اور چھ روپیہ میں مکتبہ اردو لاہور سے مل سکتا ہے۔

شکست و فتح دوسرا ڈیشن ہے علامہ جمیل منٹھری کے طویل افسانہ کا جو اس سے قبل ایک بار شایع ہو چکا تھا۔ جناب جمیل منٹھری نہ صرف صوبہ بہار بلکہ پورے ملک کے ان چند ادیبوں میں سے ہیں جو ادب و زبان کی خدمت کی غیر معمولی صلاحیت رکھتے ہیں اور جن کے قلم سے کبھی درجہ دوم کی چیز نہیں نکلتی۔ علامہ موصوف نے اس وقت تک متعدد موضوع پر بہت کچھ لکھا ہے، لیکن اپنے فطری استغناء کی وجہ سے انھوں نے ملک کو اس کا کم موقع دیا کہ وہ ان کے کمالات سے پوری طرح مستفید ہو سکتا۔ ان کی عمر کا زیادہ حصہ بنگال میں بسر ہوا اور ایسے ماحول میں جو ان کے فضل و کمال کے لحاظ سے فروتر تھا چند سال ہوئے کہ ان کے وطن (صوبہ بہار) نے انہیں علمی خدمت کے لئے چن لیا ہے اور وہ اپنے صحیح منصب پر فائز ہیں۔ یہ قصانہ اسی زمانہ کا لکھا ہوا ہے جب موصوف کلکتہ میں تھے اور اس میں وہ سب کچھ موجود ہے جو یک گہرا سوچنے والے ایک زبان پر قدرت رکھنے والے اور ایک جدت و آزاریب کے افسانہ میں ہونا چاہئے۔ یہ افسانہ درحاصل ایک فلسفیانہ تجربہ ہے جذبات محبت کا، لیکن ایسے دلکش انداز میں کہ اگر اسے افسانہ نہ کہا جائے تو بھی وہ افسانہ سے زیادہ دلگشی اپنے اندر رکھتا ہے۔ ضخامت ۱۲ صفحات - قیمت دو روپیہ۔

چھوٹا خدا مجموعہ ہے جناب عندلیب شادانی کے دو افسانوں کا جن میں سے ایک کا نام چھوٹا خدا اور دوسرے کا بے روزگار ہے اور ان دونوں پر بھی کہانی ہونے کی ہرقت ہے۔

ظاہر ہے کہ ہر واقعہ افسانہ نہیں ہو سکتا، لیکن اگر خوش قسمتی سے کسی ادیب کو کوئی ایسا واقعہ نظر آجائے جو افسانوی حیثیت رکھتا ہو تو پھر اس کے پلاٹ کے متعلق گفتگو کا کوئی موقع نہیں رکھتا اور اس طرح وہ نقد و تبصرہ سے بڑی حد تک بے نیاز ہو جاتا ہے۔ تاہم ایک پہلو زبان کا رہ جاتا ہے، سو عندلیب شادانی ایسے کچھ کار و مشاق ادیب کی زبان کی بابت یہ بحث بھی کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔ حسن اتفاق سے یہ دونوں افسانے نتیجہ خیز بھی ہیں حالانکہ اگر نہ ہوتے تو بھی اس لحاظ سے کہ وہ سچی کہانیاں ہیں، کس کو مجال دم زدن تھی۔

ضخامت ۲۵۵ صفحات - قیمت تین روپیہ - کاغذ اور کتابت و طباعت پاکیزہ، طبع کا پتہ: شیخ غلام علی اینڈ سنز - کشمیری بازار لاہور۔

نوش و نیش یہ کتاب بھی پروفیسر عندلیب شادانی کے ۱۳ افسانوں کا مجموعہ ہے اور ان میں بھی ہر ایک پر سچی کہانی لکھا ہوا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ دنیا میں کم ایسے افسانہ نگار ہوں گے جن کو اتنے صحیح گہر دلچسپ واقعات میسر آجائیں جنہیں شادانی صاحب کو میسر آئے۔ معلوم ہوتا ہے کہ قدرت خود ان کو افسانہ نگار بنانا چاہتی تھی اور جسے قدرت خود کچھ بنانا چاہے، اس کو دنیا میں کون بگاڑ سکتا ہے۔ اس مجموعہ کے تمام افسانے اس میں شک نہیں بہت دلچسپ ہیں اور شادانی صاحب نے انہیں جس تاثر کے ساتھ لطف لے لیکر بیان کیا ہے، اس نے ان کی دلچسپی میں اور اضافہ کر دیا ہے۔ ضخامت ۲۲۸ صفحات - قیمت ہے - طبع کا پتہ: شیخ غلام علی اینڈ سنز کشمیری بازار لاہور۔

دور حاضر اور اردو غزل گوئی یہ دونوں کتابیں بھی پروفیسر عندلیب شادانی کی تصنیف ہیں، پہلی کتاب میں ان تمام مضامین کو یکجا کر دیا گیا ہے جو انھوں نے حضرت، فاقی، جگر اور اصغر کی شاعری کے معائب و نقایص ظاہر کرنے کے لئے رسالہ ساتھی میں شایع کئے تھے اور دوسری کتاب نشاط رفته خود شادانی صاحب کے اشعار کا مجموعہ ہے۔ چونکہ یہ دونوں کتابیں زیادہ تفصیلی اظہار خیال چاہتی ہیں اس لئے اس فرض کو ہم آئندہ ادا کریں گے۔ ان چند سطروں کو محض رسید سمجھنا چاہئے۔

نشاط رفته

نگار کی پرائی مکمل جلدیں

۳۱ء	۳۲ء	۳۵ء	۳۶ء
۵۵۰	۵۵۰	۵۵۰	۵۵۰
۳۴ء	۳۷ء	۳۸ء	
۵۵۰	۵۵۰	۵۵۰	فہرست نگار

تنقیدی اشائے

پروفیسر آل احمد سرور ریڈر شعبہ اردو لکھنؤ یونیورسٹی کے انیس تنقیدی مقالات کا مجموعہ جو ہندوستان کی مختلف یونیورسٹیوں میں شامل ہے پروفیسر سرور اس عہد کے نہایت مشہور نقادوں میں سے ہیں اور انکی تنقیدی مقالات سنی حیثیت رکھتے ہیں۔ ضخامت ۲۳۲ صفحات کاغذ ۲۸ پونڈ۔ قیمت تین روپیہ علاوہ محصول - منجر نگار - لکھنؤ

جھوٹا اشتہار دینا حرام ہے بس اس سے زیادہ میرے پاس کوئی ثبوت صداقت نہیں ہے، ماننا نہ ماننا آپ کا فعل ہے

معجون عنبری :- دوا دنیا بھر میں مقبولیت حاصل کر چکی ہے دلالت تک اسکے مزاج موجود ہیں۔ دماغی کمزوری کے لئے اکسیر صفت ہے جو ان پورے سب کھاتے ہیں اس دوا کے مقابلہ میں سیکڑوں قیمتی ادویات اور کئی جات بیکار ہیں اس سے بھوک اس قدر بڑھتی ہے کہ دو تین سیر دوا دھو اور ہاؤ بھر گھی ہضم کر سکتے ہیں، اس قدر قوی دماغ ہے کہ بچپن کی باتیں بھی خود بخود یاد آئے لگتی ہیں، اس کو مثل آب حیات کے تصور فرمائیے اسکے استعمال کرنے سے پہلے اپنا وزن کر لیجئے، ایک پیشی چھ سات سیر خون آپ کے جسم میں اضافہ کر دی اسکے استعمال سے ۱۸ گھنٹے کام کرنے سے غفلت چھوٹے ہوگی اور یہ دوا خواتین کو مثل گلاب کے پھول کے سرخ اور مثل کنڈن کے درخشاں بنادے گی۔ یہ دوائی نہیں ہے بلکہ ہزاروں ایسے علاج اسکے استعمال سے باہر اور بگڑ گئے ہیں سو سال کے جوان بن گئے ہیں۔ یہ نہایت درجہ مقوی ذہن ہے کہ آپ صبر و تحمل نہیں کر سکتے انقدر اسکی صفت تحریر میں نہیں آسکتی تجربہ کر کے دیکھ لیجئے اس سے بہتر مقوی دوا دنیا بھر میں نہیں ہے۔ قیمت فی پیشی ۲۴ خوراکی چار روپیہ (لکھنؤ)

نوٹ :- فائدہ نہ ہو تو قیمت واپس۔ فہرست دوا خانہ مفت منگائیے۔ میں اشد کو حاضر و ناظر جان کر لکھتا ہوں کہ یہ دوا اکسیر کا کام کرتی ہے نقالوں سے ہوشیار رہئے میری ۳۱ سالہ شہرت پر غور فرمائیے

ہتہ :- حکیم شابت علی پنج زبان خوش کلام
(عالم منوی مولاناے روم صاحب)
محمود نگر ۳ لکھنؤ۔ یو۔ پی

رفیق صحت لاہور

کاہلہ شمارہ "تپ وق نمبر" تھا۔ اس کی افادیت کے پیش نظر عوام نے اسے توقع سے بڑھ کر پسند کیا۔ اس کے بعد اگست نمبر دانتوں کی صفائی یعنی "پائیوریا" پر شائع ہوا۔ ستمبر کا پرچہ خنازیر کے لئے وقف ہے اگر آپ اب تک اس کے خریدار نہیں ہوئے تو فوراً ہو جائیں ورنہ مجربات و نوادرات کا یہ ذخیرہ آپ کسی قیمت پر بھی حاصل نہ کر سکیں گے۔ بھارت کے رہنے والے اصحاب دور و پیہ دفتر نگار میں جمع کر کے فوراً ہمیں اطلاع دیں۔ پرچہ آپ کے نام جاری کر دیا جائے گا۔
منجر سالہ رفیق صحت داتا گنج بخش لاہور

قول فیصل

جس میں ملک کے مشہور مفکر و بلند خیال شاعر علی اختر حیدر آبادی نے جوش کی مشہور نظم "حرف آخر" کو سامنے رکھ کر اس کے تمام خیالات کی تردید کی ہے اور ثابت کیا ہے کہ انسان لاکھ ترقی کرے کتنی ہی عقل و فرا سے کام لے لیکن ایک وقت ایسا آتا ہے جب اس کو خدا کے سامنے سر جھکانا ہی پڑتا ہے۔ فنی حیثیت سے اختر کا یہ وہ عظیم الشان کارنامہ ہے جسے ان کے شاعرانہ عروج کے ثبوت میں باسانی پیش کیا جاسکتا ہے شروع میں حضرت نیاز فتحپوری کا مقدمہ بھی شامل ہے۔
کاغذ ۲۸ پونڈ دبیز گرد پوش رنگین قیمت دو روپیہ۔ علاوہ محصول
نگار ملک ایجنسی لکھنؤ

مرزا شوق لکھنوی کا تنقیدی مطالعہ

(از پروفیسر خواجہ احمد فاروقی)

مرزا شوق، جان عالم واحد علی کے لکھنؤ کے شاعر تھے۔ ان کی شہنوی کا تنقیدی مطالعہ نہ صرف ادب کے محرکات اور میلانات کو سمجھنے کے لئے ضروری ہے بلکہ اس تہذیبی ماحول کو جاننے کے لئے بھی جب یہ معلوم ہوتا تھا کہ حکم تھا کہ جام شراب کی گردش سے پھر دیا گیا ہے۔
قیمت علاوہ محصول ڈیڑھ روپیہ - منجر نگار لکھنؤ

دی مغل لائن لمیٹڈ

سب سے پرانی ہندوستانی جہاز ران کمپنی

بحر احمر اور مارشس

کی بندرگاہوں کو مسافروں اور مال لے جانے والے جہازوں کا بیڑہ

بھی سے

عدن، جدہ، پورٹ سوڈان اور مصر

کی بندرگاہوں کے درمیان ہمارے جہازوں کی آمد و رفت
باقاعدگی اور خوش اسلوبی سے ہوتی ہے اور امید ہے کہ ضرورت
پڑنے پر دوسری بندرگاہوں کو بھی اپنے جہاز روانہ کر سکیں گے
مزید معلومات کے لئے
حسب ذیل پتہ پر لکھئے

ٹرنر مارین اینڈ کمپنی لمیٹڈ

۱۶۔ بینک اسٹریٹ۔ بمبئی

مکتوبات نیاز

(تین حصوں میں)

شہاب کی سرگزشت

جذبات بھاشا

فلاسفہ قدیم

شاعر کا انجام

حضرت نیاز کا وہ قدیم نظیر جناب نیاز نے ایک

اس مجموعہ میں حضرت نیاز

جناب نیاز کے غفوان بھاشا

افسانہ جو اردو زبان میں

دلچسپ تمہید کے ساتھ بہترین

کے دو علمی مضامین

کا لکھا ہوا افسانہ حسن و عشق

کی تمام نثر بخش کیفیات

بالکل پہلی مرتبہ سیرت نگاری

ہندی شاعری کے نمونے

شامل ہیں :-

(۱) چند گھنٹے فلاسفہ قدیم

اس کے ایک جملہ میں موجود

کے اصول پر لکھا گیا ہے اسکی

پیش کر کے ان کی ایسی

(۱) چند گھنٹے فلاسفہ قدیم

کی روحوں کے

ہیں یہ افسانہ اپنے پلاٹ

زبان و تخیل اس کی نزاکت

تشریح کی ہے کہ دل بیتاب

کی روحوں کے

ساتھ

اور انشاء کے لحاظ سے

بیان اس کی بلندی مضمون

ہو جاتا ہے اردو میں یہی

سب سے پہلی کتاب اس

(۲) مادیات کا مذہب

اس قدر بلند چیز ہے کہ دوسری

اور اس کی انشاء حالیہ سحر

سب سے پہلی کتاب اس

(۲) مادیات کا مذہب

نہایت مفید و دلچسپ

جگہ اس کی نظیر نہیں مل سکتی

حلال کے درجہ تک پہنچتی

موضوع پر لکھی گئی ہے

نہایت مفید و دلچسپ

جس میں ہندی شاعری

تازہ آدین نہایت صحیح و

یہ آدین نہایت صحیح

اور خوش خط ہے

کے بے مثل نمونے نظر آتے ہیں

قیمت

خوش خط، سرورق رنگین

قیمت ہر حصہ کی

قیمت دو روپے

قیمت بارہ آنے

ایک روپیہ

قیمت بارہ آنے

علاوہ محصول

علاوہ محصول

علاوہ محصول

علاوہ محصول

علاوہ محصول

علاوہ محصول

علاوہ محصول

علاوہ محصول

علاوہ محصول

علاوہ محصول

علاوہ محصول

علاوہ محصول

علاوہ محصول

علاوہ محصول

علاوہ محصول

فراسٹ الیڈ

نقاب گھجانی کے بعد

مذاکرات نیاز

انتقادیات

مذہب

مولفہ نیاز فتحپوری اس کے

نیاز فتحپوری کے تین افسانوں

یعنی حضرت نیاز کی ڈائری

حضرت نیاز کے انتقادی مقالے

حضرت نیاز کا وہ

کا مجموعہ جس میں بتایا گیا ہے

جواد بیات و تنقید عالیہ کا

کا مجموعہ، فہرست مضامین پر

معرکہ آرا مقالہ جس میں

حضرت نیاز کا وہ

کہ ہمارے ملک کے ادیان

عجیب غریب ذخیرہ ہے

ایران ہندستان کا اثر جرمن

انھوں نے بتایا ہے کہ

حضرت نیاز کا وہ

طریقت علمائے کرام کی

ایک بار اس کو شروع کر دینا

شاعری پر فارسی زبان کی

مذہب کی حقیقت کیسا

حضرت نیاز کا وہ

اندونی زندگی کیا ہے اور

اخیر تک پڑھ لینا ہے

پیدائش پر خوفناک نظر آرد و

ہے اور دنیا میں کیونکر

حضرت نیاز کا وہ

ان کا جو دہماری معاشرت

بھی جدید آدین جو جس میں

شاعری پر تاریخی تبصرہ آرد و

راج ہوا اس کے مطالعہ

حضرت نیاز کا وہ

اجتماعی حیات کیلئے کس رتبہ

صحت اور نفاست کا غور

غور گوئی کی عہد بہ عہد ترقی

کے بعد انسان خود فیصلہ

حضرت نیاز کا وہ

سم قاتل ہو، زبان پلاٹ

طباعت کا خاص اہتمام

نقشائے رنگ رنگ (غالب)

کر سکتا ہے کہ مذہب کی

حضرت نیاز کا وہ

انشاء کے لحاظ سے جو مرتبہ

کیا گیا ہے

کی فارسی غور گوئی پر تبصرہ

پابندی کیا معنی رکھتی ہے

حضرت نیاز کا وہ

ان افسانوں کا ہے وہ صرف

قیمت

ادبیات و اصول نقد

قیمت

قیمت

قیمت ایک روپیہ

ایک روپیہ

ایک روپیہ

ایک روپیہ

ایک روپیہ

علاوہ محصول

علاوہ محصول

علاوہ محصول

علاوہ محصول

علاوہ محصول

علاوہ محصول

علاوہ محصول

علاوہ محصول

علاوہ محصول

علاوہ محصول

نگار کے خاص نمبر

جنوری ۱۹۴۷ء

فروری مارچ

جنوری ۱۹۴۳ء

۱۹۴۶ء

اس سالنامہ کا نام ماجد ولین نمبر ہے جس میں ایک نیشنل فریسی ادیب کی ایک شاعر ٹریجڈی کو اردو میں منتقل کیا گیا جو ادب اور جذبات نگاری کے لحاظ سے ناول اپنا نظیر نہیں رکھتا قیمت ایک روپیہ علاوہ محصول

جو فن انتقاد بر ملک کے بہترین اہل قلم اور ارباب فکر کے مضامین پر مشتمل ہے قیمت دو روپیہ علاوہ محصول

اس نمبر میں ریاض خیر آبادی مرحوم کے کلام بر ملک کے متعدد مشاہیر نے نقد و تبصرہ کر کے بتایا ہے کہ ریاض کی شاعری کیا تھی قیمت ایک روپیہ علاوہ محصول

جنوری، فروری ۱۹۴۹ء

جنوری فروری ۱۹۴۸ء

نگار کا افسانہ نمبر ہے جس میں تقریباً تیس افسانے بہترین اہل قلم کے شائع کئے گئے ہیں۔ اس سالنامہ کی خصوصیت یہ ہے کہ اس کے مطالعہ سے آسانی معلوم کیا جاسکتا ہے کہ افسانہ نگاری کے کتنے اسکول ہیں اور ہر اسکول کا معیاری فناء کیسا ہونا چاہئے قیمت دو روپیہ علاوہ محصول

پاکستان نمبر نگار کا جو بی نمبر جس میں دنیا کے سامنے اسلام کی عظمت رفتہ اور تمدن اسلام کے بلند حقائق کو پیش کیا گیا ہو تاکہ مسلمان اپنے مستقبل کی تعمیر کے وقت اسلام کے دور زرین کو نہ بھول جائے جن پر مسلم حکومت کی ترقی کی بنیاد قائم ہوئی تھی۔ قیمت تین روپیہ علاوہ محصول

جنوری ۱۹۵۱ء

جنوری فروری ۱۹۵۰ء

اس سالنامے کے دو حصے ہیں پہلے حصے میں مارچ ہندوستان کی مشہور عالم کتاب ایک مستقبل کی تلاش کا ترجمہ و اقتباس ہے جس میں اس نے ایران، مصر، عراق و فلسطین وغیرہ ممالک اسلامی کی سیاحت کے بعد وہاں کی موجودہ اقتصادی زبوں حالی اور ان کے اسباب پر روشنی ڈالی ہے اور اسی کے ساتھ یہ بھی بتایا ہے کہ ان کا مستقبل کتنا روشن ہے اگر وہ ترقی کے صحیح راستہ کو جان لیں۔ سالنامہ کا دوسرا حصہ ڈیڑھ نگار کے قلم کا ہے جس میں پہلی جنگ کے بعد مسلم حکومتوں کے انقلاب کی تاریخ اور اس کے اسباب کو ظاہر کیا گیا ہے قیمت دو روپیہ

نگار کی ۲۸ سالہ ادبی و تنقیدی خدمات کا پتہ جس میں ۱۹۲۲ء سے لے کر ۱۹۴۹ء تک کے تمام تنقیدی رجحانات و انتقادی نمونوں کو واضح کیا گیا ہے اس میں بعض ایسے اکابر شعراء کا تذکرہ و انتخاب کلام بھی شامل ہے جن کے حالات عام طور پر معلوم نہیں ہیں اور جن کا کلام نایاب ہے۔ اس میں جدید تنقیدی میلانات اور ترقی پسند نقادوں کے مقالات بھی شامل ہیں قیمت تین روپیہ علاوہ محصول

سالنامہ ۱۹۴۸ء

جولائی ۱۹۵۱ء

مومن نمبر

جو ختم ہو چکا تھا اور جس کی مانگ بہت زیادہ تھی دوبارہ شائع کیا گیا ہے مومن کے مطالعہ کے لئے اس کا پڑھنا از بس ضروری ہے۔ قیمت دو روپیہ علاوہ محصول

ایک منتقل کتاب ہے جس کا نام ہے ۵۵ سال کے بعد یہ کتاب نفیات علی بر آنا مفید و دلچسپ لڑ بچہ ہے کہ آپ اس کو ایک بار ہاتھ میں لینے کے بعد اس وقت تک چھوڑ ہی نہیں سکتے جب تک ختم نہ کر لیں۔ یہ کتاب آپ کو بتائے گی زندہ رہنا بھی ایک فن ہے اور اگر اس فن کو آپ سمجھ لیا تو پھر (۱) دنیا کا ہر بچہ دالم آپ کیلئے بنے ہو جائے گا (۲) آپ کی زندگی کا ہر لمحہ حیات کو آغا ہو گا (۳) آپ کی عمر طبعی کا معیار باطل ہو جائے گا (۴) ان خطاط عمر اور جینی کا موجودہ مفہوم قطعی باقی نہ رہے گا۔ (۵) شاہراہ حیات پر چلنے کا وہ طریقہ آپ کو معلوم ہو جائے گا جو اس وقت تک آپ کی آنکھوں اور جمل تھا قیمت ۱۲